Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر - دسمبر 1961ء

IN MEMORY OF THE QUAID

The adoption of Western economic theory and practice will not help us in achieving our goal of creating a happy and contented people. We must work our destiny in our own way, and present to the world an economic system based on the true Islamic concept of equality of mankind and social justice. We will thereby be fulfilling our mission as Muslims and giving to humanity the message of peace which alone can save it and secure the welfare, happiness and prosperity of mankind.

(Opening ceremony of the State Bank of Pakistan, Karachi, on 1-7-1948.)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

اس پرچے کی قیمت - ایک روپیہ - پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدل اشتراک

ہندو پاکستان سے سالانہ ...... آٹھ روپے

غیر ممالک سے ...... ۱۶ شلنگ

اس پرچہ کی قیمت

ہندو پاکستان سے

ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۵۰۰،

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گل برگ - لاہور

جلد ۱۴ — نومبر - دسمبر ۱۹۶۱ء — نمبر ۱۱-۱۲

فہرست مضامین

لمعات	۲
باب المراسلات - نماز کی اہمیت - سینما دیکھنا کیسا ہے؟	۹
مرکزِ ملت	۱۴
دوسری بیوی	۲۱
مسلمان کی زندگی (محترم پرویز صاحب)	۳۶
یوم انقلاب	۴۱
سرسید - اقبال - اور قائدِ اعظم (محترم صفدر سلیمی صاحب)	۶۱
سرگودھا سب کنونشن	۸۱
رابطۂ باہمی	۸۴
نقد و نظر	۸۷
ایک کمیونسٹ نوجوان سے	۹۳
انسان (محترم پرویز صاحب)	۱۰۰
اسلام پر یونانی و رومی تہذیب کے اثرات (علامہ احمد امین مصری)	۱۱۱
احتساب	۱۳۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کریم' دنیائے فکر و عمل میں جو عظیم انقلابات لایا' ان میں ایک بنیادی انقلاب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے ہر دعوے کی بنیاد' علم و بصیرت پر رکھی اور اسے ماننے کے لئے عقل و فکر سے اپیل کی۔ وہ وحی کے متعلق تو یہ کہتا ہے کہ وہ انسانی عقل و فکر کی پیدا کردہ نہیں۔ اس کا سرچشمہ' ماورائے فکرِ انسانی ـــــ علمِ خداوندی ـــــ ہے' لیکن وحی کی تعلیم کو سمجھنے اور ماننے کے لئے' عقل و بصیرت ہی کو دعوت دیتا ہے۔ مذہب کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا ـــــ اور اب تک بالعموم یہی سمجھا جاتا ہے ـــــ کہ اسے عقل و فکر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور اسے بلا دلیل و برہان مانا جاتا ہے ـــــ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے' کہ مذہب اور عقل ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ لہٰذا "مذہب" کی اسٹیج سے یہ اعلان کہ اسے علم و بصیرت کی بنا پر سمجھا اور دلیل و برہان کی رو سے مانا جاتا ہے' بہت بڑا انقلاب تھا۔ آپ قرآن کریم کے اوراق کو پلٹیے۔ شروع سے اخیر تک' قدم قدم پر غور و تدبر کی تاکید اور عقل و فہم سے کام لینے کی تلقین ملے گی۔ غور و تدبر بھی محض نظری طور پر نہیں بلکہ محسوس تجربات و مشاہدات کے بعد' صحیح نتائج تک پہنچنے کے طریق پر عمل پیرا ہونے سے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے "سمع و بصر و فؤاد" کو ذرائع علم قرار دیا ہے۔ "سمع و بصر" (سننا اور دیکھنا) محسوس مشاہدات و تجربات کے ذرائع ہیں اور فؤاد (MIND)' ان ذرائع کی رو سے حاصل شدہ معلومات پر غور و تدبر سے نتائج تک پہنچنے کی صلاحیت کا نام ہے۔ وہ ان ذرائع علم و فکر کو انسان کی وہ بنیادی خصوصیت قرار دیتا ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ سورۂ السجدہ میں دیکھئے۔ اس نے پہلے ان مختلف مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے حیوان اور انسان کا بچہ (جنین) گزرتا ہے۔ یہ مراحل دونوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد' انسان کے متعلق کہا ہے کہ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

الْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۳۲/۹)۔ اس نے تمہیں سمع و بصر و فواد عطا کئے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ان بیش بہا عطائے خداوندی کے قدر شناس ہیں۔ اس حقیقت کو اس نے کئی ایک اور مقامات پر بھی دہرایا ہے۔ وہ ان ذرائع علم سے کام نہ لینے والوں کو حیوانات سے بدتر' بلکہ جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں دیکھئے' وہ کس وضاحت سے اس نکتہ کو بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ تم بیشتر "جن وانس" کو دیکھو۔ ان کی حالت تمہیں بتا دے گی کہ وہ پیدا ہی جہنم کے لئے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وہ دل تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ ان کے کان بھی ہیں' لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ تمہیں شکل و صورت سے انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت' اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ یہ لوگ' انسان نہیں حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) یہ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں۔

انہی کے متعلق' دوسری جگہ ہے اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ عقل و سماعت سے کام لیتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۧ (۲۵/۴۴)۔ یہ لوگ بالکل حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ دوسری جگہ انہیں "بدترین خلائق" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۸/۲۲)۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بن کر زندگی بسر کرتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ سورۃ الملک میں ہے کہ جن لوگوں کو جہنم میں بھیجا جائے گا وہ کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (۶۷/۱۰)۔ اگر ہم سننے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو آج اہل جہنم میں سے نہ ہوتے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ ہم نے تمہیں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔ لیکن وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اس نے تم میں سے بہت سی جماعتوں کو گمراہ کر دیا۔ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳۶/۶۲)۔ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے تھے؟ اگر تم عقل و فکر سے کام لیتے تو وہ تمہیں کبھی گمراہ نہ کر سکتا۔ اور آج تم جہنم کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تاکید کرتا ہے کہ

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! سماعت۔ بصارت اور فؤاد ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ تم سے کام لیا گیا تھا یا نہیں)۔

"سننے اور دیکھنے" سے مراد، محض طبیعی طور پر (physically) سننا اور دیکھنا نہیں۔ اس سے مفہوم، عقل و بصیرت اور فہم و تدبر سے کام لینا ہے۔ یہ فرق قرآن کریم نے خود بتا دیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ۔ تو نظر بظاہر دیکھے گا کہ وہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں۔ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۹۸)۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ "دیکھ نہیں رہے"۔ وہ محض بصارت سے کام لے رہے ہیں، بصیرت سے نہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو تیری طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن وہ درحقیقت "سنتے نہیں"۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (۴۲)۔ کیا تو ایسے بہروں کو سنا سکتا ہے جو عقل و فکر سے کام نہ لیں۔ دیکھنا، اُس کا دیکھنا ہے جو عقل و بصیرت سے کام لے، اور سننا، اس کا سننا ہے جو فہم و فراست سے بات سمجھنے کی کوشش کرے۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے سے آنکھوں اور کانوں (بصارت و سماعت) کے طبیعی افعال (physical function) پر اثر نہیں پڑتا۔ فہم و فراست کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ سورۂ حج میں ہے اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر (اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف کا مطالعہ نہیں کیا جو) ان کے قلوب میں عقل و فکر کی صلاحیتیں بیدار ہوتیں۔ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا یا ان کے کان اس قابل ہو جاتے کہ ان سے سننے کا کام لے سکتے۔ یاد رکھو! فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۴۶)۔ انسان کے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ وہ دل اندھے ہوا کرتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ اسی کو وہ "دلوں پر مہریں لگ جانے" سے تعبیر کرتا ہے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۹۸)۔ جو لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے، اللہ کا قانون مکافات، ان کے دلوں پر اس طرح مہر لگا دیتا ہے۔

یہ غور و تدبر، صرف خارجی دُنیا کے معاملات تک محدود نہیں۔ خود قرآن کریم بھی اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ بلکہ، اس باب میں قرآن کریم کو تو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس لئے کہ جماعت مومنین خارجی دُنیا کے معاملات کا حل بھی تو قرآن کریم ہی کی روشنی میں دریافت کرتی ہے۔ اس لئے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم پر غور و تدبر کی خاص طور پر تاکید کی ہے۔ سورۂ النساء میں ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۸۲)۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔ دوسری جگہ ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (۴۷/۲۴) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ یا ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہیں کہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنی تعلیم ہس انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس سے انسان کے سامنے غور و فکر کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲/۲۱۹)۔ اس طرح اللہ اپنے قوانین کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم، دنیا اور آخرت میں، غور و فکر کر سکو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم، اپنے قوانین کی روشنی میں، دنیاوی معاملات ہی میں نہیں، بلکہ اخروی امور میں بھی غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔

قرآن کریم، جس طرح جماعتِ مومنین کو غور و فکر کی تاکید کرتا ہے، اسی طرح وہ غیر مسلموں کے سامنے بھی اپنی دعوت، علم و بصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا اور دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ اس نے نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (۱۲/۱۰۸)۔ ان سے کہدو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو وہ علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ وہ بھی اپنی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کریں گے۔ اپنا پیغام علیٰ وجہ البصیرت پیش کیا، اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ اس پر غور و فکر کریں۔ جس انداز سے یہ دعوت دی گئی ہے، اس سے غور و فکر کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى یہ کہ تم ایک ایک، دو دو کر کے، اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۭ پھر تم غور و فکر کرو۔ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ (۳۴/۴۶)۔ تم غور و فکر کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ تمہارا یہ رفیق جو تمہیں اس قسم کی باتیں کہہ رہا ہے، پاگل نہیں ہے۔

ان کے سامنے اپنی دعوت، علیٰ وجہ البصیرت پیش کی، اور انہیں اس کی آزادی دی کہ وہ اسکی مخالفت کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں، لیکن اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کریں۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱)۔ ان سے کہو کہ، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں اپنی دلیل پیش کرو۔ نہ ہم اپنی بات دھاندلی سے منوانا چاہتے ہیں۔ نہ تم اس کی مخالفت اندھا دھند کرو۔ ہم بھی دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ تم بھی دلائل لاؤ۔ وہ اپنے مخالفین کے خلاف، سب سے بڑا الزام یہ عائد کرتا ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ بات پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں، علمی سطح پر گفتگو کریں، جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، اسے تحمل سے سنیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور پھر دلائل و براہین کی تائید

اپنے اعتراضات پیش کریں، شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور، جب کوئی بات بن نہیں پڑتی، تو الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں پر اتر آتے ہیں۔ اس مقام پر قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں سے بات کرنا، محض اپنے وقت اور توانائی کو ضائع کرنا ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (۷۳/۱۰)۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر تحمل کرو۔ اور ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ لیکن کنارہ کشی بھی حسن کارانہ انداز سے ہو۔

یہاں سے ایک بڑی اہم بات سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ، بجائے اس کے کہ علم و بصیرت، عقل و دانش اور فکر و تدبر سے کام لیں، فوراً پست جذبات پر اُتر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، ان لوگوں کے خلاف الزام یہ نہیں کہ یہ لوگ کم علم اور بے وقوف ہیں۔ الزام یہ ہے کہ یہ ایسے سنجیدہ موضوعات پر، علم و عقل کی رُو سے بات کرنے کے بجائے، جھٹ جذباتی ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرنا شروع کر دیتے ہیں نتیجہ اس کا یہ کہ، علم و بصیرت کی رُو سے کسی فیصلہ کن مقام تک پہنچنے کے بجائے، بات انکے شور و غوغا میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے جذباتی ہو جانا، سب سے بڑا جرم ہے۔ جب انسان جذباتی ہو جائے تو اس کا علم و فکر اس کے کسی کام نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ۔ خدا کے قانونِ مکافات نے اس کے علم و عقل کے باوجود، صحیح راستہ اسکی نگاہوں سے گم کر دیا۔ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵/۲۳)۔ اور اس کی سماعت اور قلب پر مہریں لگا دیں اور اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ انسان جذبات کی شدت میں کس طرح ہوش و حواس کھو دیتا ہے، اور علم و عقل کے باوجود، کس طرح وہ پاگلوں کی سی باتیں کرتا ہے، اس کا اندازہ ایک شرابی کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ شراب، انسان کے جذبات کو تیز تر کر دیتی ہے جس سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ جذبات پرستی، یہی کچھ کرتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (۴۷/۱۶)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ۙ
اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ (۲۵/۴۳-۴۴)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا! ــــ تو

اس پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ وہ عقل و فکر سے کام نہ لے تو بھی تو اُسے زبردستی صحیح راستے پر چلائے۔
— کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ یہ حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ علم و عقل سے کام لینے کے بجائے، جھٹ سے جذباتی ہو جائے اور فریقِ مقابل کی بات کا جواب دلیل و برہان کی رُو سے دینے کے بجائے، محض ضد اور سرکشی سے اس کی مخالفت کرتی جائے، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں، غور و فکر اور عقل و بصیرت سے معاملات کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ وہ تباہ شدہ اقوام کی داستانیں بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ۔ ان لوگوں کو دنیا میں اس قدر تمکن و اقتدار حاصل ہوا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن حاصل نہیں ہوا وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ؗ اور انہیں سماعت و بصارت و نُوا دسب عطا ہوئے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ لیکن جب انہوں نے یہ روش اختیار کر لی کہ قوانینِ خداوندی پر غور و فکر کی بجائے، محض ضد اور سرکشی کی بنا پر ان کی مخالفت کی جائے تو وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) اور جس بات کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں گھیر لیا۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات پر غور فرمائیے اور پھر سوچئے کہ اس کی تعلیم کا منشاء کیا ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ آپ کے سامنے پیش ہو تو آپ نہایت اطمینان اور سکون سے اس پر غور کریں۔ غور و تدبر سے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں اور پھر اس طرح کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ اگر آپ کو کسی کی رائے یا خیال سے اختلاف ہے، تو اس سے فوراً بھڑک نہیں اُٹھنا چاہیئے۔ اس کی بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ اور اپنے خیال کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرنی چاہئیں۔ اور آخر الامر اگر دیکھا جائے کہ وہ حق پر ہے، تو کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اس کا ہمنوا ہو جانا چاہیئے۔ قرآن کریم زندہ قوموں کی یہی روش بتاتا ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارا مزاج بڑا تند و تیز ہو چکا ہے۔ ہم میں تحمل، برداشت اور سہار کا مادہ بالکل نہیں رہا۔ ہم دوسرے کی بات سننے اور اُس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ ہم تھوڑے سے اختلاف کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ہم کسی معاملہ پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار نہیں کرتے۔ ہم علمی موضوعات پر بھی علمی انداز سے گفتگو نہیں کرتے۔ ہم متانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر، فوراً جذباتی ہو جاتے ہیں اور سارا زور اسی

صرف کر دیتے ہیں کہ ہمارے سامعین یا قارئین کے جذبات مشتعل ہو جائیں اور اس طرح بات کسی نتیجہ تک پہنچنے کے بجائے اس ہنگامہ میں گم ہو کر رہ جائے۔ ہمارا یہ انداز عام ہو رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے اُلجھے ہوئے معاملات (خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) سلجھ ہی نہیں پاتے۔ بلکہ دن بدن اور اُلجھتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے، اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

اگر ہم اپنی قوم کو اس تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریق اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم قوم کو اس کا عادی بنائیں کہ وہ ہر بات کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے، اور غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ وہ اختلافی امور میں تحمل اور برداشت سے کام لے اور جذبات کی طوفان انگیزیوں میں بہ جانے کے بجائے علم و بصیرت اور عقل و دانش سے معاملات کو سلجھانے کا طریق اختیار کرے۔ خدا کرے کہ قوم کی سمجھ میں یہ بات آجائے +

انسان نے کیا سوچا؟

دُنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکے گی

اس سوال کا جواب کہ کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتی ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟

افلاطون سے لے کر عصر حاضر کے مفکرین، مورخین، سائنسدانوں کی معرکہ آرا کتابوں کے سینکڑوں اقتباسات۔ تقطیع کلاں۔ دوسرا ایڈیشن

قیمت ——— بارہ روپے

ملنے کا پتہ:- **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ**

۲۷- بی ——— شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

بابُ المراسلہ

نماز کی اہمیت

(پرویز)

ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں۔

(۱) آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانین خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے؟

(۲) نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے؟

(۳) کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں؟

جواب

(۱) اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکام خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا۔ ان کی پوری پوری اطاعت کرنے کا۔ نماز، اس طرح سرِ تسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکا دینے (سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے، فیصلے اور عمل میں اس کے احکام کی اطاعت کرے گا جس کا دل، جذباتِ فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے لبریز ہو، اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جائے گا۔ اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا سبکی محسوس کرتا ہے وہ اس کی اطاعت کیا کرے گا؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے، اس کا نماز میں رسمی طور پر سر جھکا دینا، مقصد صلوٰۃ کو پورا نہیں کر سکتا۔

(۲) نماز فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہل ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ، اجتماعاتِ صلوٰۃ کے لئے استعمال کر لیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروج ہے (میں سمجھتا ہوں کہ جو اصطلاحات قرآنِ کریم نے مقرر کی ہیں انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت و محکومیت

اختیار کرتا ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ میں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ل۔و (ی) کے تحت) آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے وہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں، پہلوی زبان کا ہے)

اس کے بعد ارکان صلوٰۃ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔

انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ، خوشی، تعجب، عزم و ارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار انسان کی طبیعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے "سر تسلیم خم" ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض (FORMALISM) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (FORM) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (FORM) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہوگا تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی

کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دیگا۔ احترام و عظمت، انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی ایک خاص اصطلاح "اقامتِ صلوٰۃ" ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ میں، قوانینِ خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنا بریں اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور، محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامتِ صلوٰۃ سے مراد اجتماعات نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلوٰۃ کے معنی نماز اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی اجتماعاتِ صلوٰۃ کا قیام واضح الفاظ میں دیئے ہیں۔ اور اس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

(۳) ایک مقام پر نہیں، متعدد مقامات پر۔ اور ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ان میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے میں فرقہ اہلِ قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنھوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہو جائے اور وہ تمام امت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کر دے تو یہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا موثر اقدام ہوگا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہوگی۔ اُس وقت امت میں وحدت تھی۔ اس لئے جب ہم پھر سے اسی عہدِ سعادت مہد کی طرف رُخ کریں گے تو امت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی۔ اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب

امت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں، تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔

سینما دیکھنا کیسا ہے؟

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ سینما دیکھنا جائز ہے یا ناجائز اور اسے بہتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ سینما بجائے خویش نہ جائز ہے نہ ناجائز۔ سینما معلومات میں اضافہ کرنے، خیالات پھیلانے یا جذبات کو ابھارنے کا ذریعہ ہے۔ اگر وہ معلومات مفید، خیالات نیک اور جذبات صالح ہوں تو سینما جائز ہی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ ذریعہ بن سکتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں ایسی ہوں جن سے قلبی اور ذہنی صلاحیتیں بگڑتی اور اخلاق خراب ہوتے ہوں تو سینما بیحد مذموم اور ممنوع ہے۔ اور یہ چیز سینما تک ہی محدود نہیں جتنی چیزیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، ان سب کی یہی کیفیت ہے۔ مثلاً دولت یا قوت اگر تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف ہوتی ہے تو بڑی مستحسن ہے۔ اگر اس کا نتیجہ تخریب ہے، تو سخت معیوب ہے۔

جس قوم کے سامنے زندگی کا بلند مقصد ہو، وہاں سینما یا اس قسم کے نشر و اشاعت کے اور ذرائع، اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں یہ شکل نہ ہو وہاں یہ صرف کاروباری (کمرشل) جنس بن جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز کاروباری سطح پر آجائے تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ کاروبار چلانے والے کے سامنے اپنے مفاد کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو نہیں سکتا۔ وہ وہی مال منڈی میں لائے گا جس کے زیادہ خریدار ہوں۔ اس طرح سینما، عوام کے ذوق یا جذبات کی تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ بن جائیگا یہی حالت پریس کی ہے جو سینما سے بھی زیادہ موثر ذریعہ نشر و اشاعت ہے۔ قوم کے سامنے مقصد ہوگا تو پریس عوام کے ذہن کی سطح بلند کرتے ہوئے، انھیں اس مقصد کی طرف لے جائے گا۔ اگر اس کی حیثیت کاروباری ہوگی تو وہ عوام کے رجحانات کا ساتھ دے گا اور انہی کے جذبات کی ترجمانی کرے گا خواہ وہ رجحانات و جذبات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ جو شخص اس مقصد کو لے کر میدان میں آئے گا کہ وہ عوام کے غلط رجحانات و جذبات کی اصلاح کرے ان میں صحیح تبدیلی پیدا کرے، اور ان کی قلبی و ذہنی سطح بلند کرے، ان میں صحیح اور غلط کے پرکھنے کی صلاحیت پیدا کر دے، اسے قدم قدم پر سخت موانع درپیش ہوں گے۔ اسے ساتھی بہت کم ملیں گے اور مخالفت بڑی شدید ہوگی۔ اس لئے اکثر و بیشتر ہوگا یہ کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا۔

لہٰذا سینما ہو یا اسی قسم کے نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع، انھیں انفرادی کاروباری سطح پر نہیں ہونا چاہیئے اصل یہ ہے کہ ایک نومولود بچے کی پرورش کی طرح ایک نومولود قوم کی تربیت کے سلسلے میں کاروباری ذہنیت

تباہ کن ہوتی ہے۔ اس میں لاگت اور بازیافت (RETURN) کا حساب ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں خرچ برابر کیا جائے گا اور "آمدن" کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ اس بچے کی کس قدر پرورش اور اس قوم کی کس حد تک تربیت ہو رہی ہے۔ اس کے لئے ذہنیت مادرانہ ہونی چاہیئے، نہ کہ تاجرانہ۔ مادرانہ ذہنیت معاوضہ کے خیال کے بغیر ایثار کی حامل ہوتی ہے۔ قرآن ایسا نظام (دین) تجویز کرتا ہے جس میں معاشرہ کا افراد کے ساتھ اسی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ جس طرح افراد کی طبیعی پرورش کا بلا معاوضہ کفیل ہوتا ہے، اسی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے وہ ذرائع رزق اور ذرائع تربیت قلب و دماغ کو تعمیر افراد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور چونکہ اس کے سامنے زندگی کا نصب العین خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی تمام جدوجہد کا رُخ اسی نصب العین کی طرف ہوتا ہے اس کا یہی نصب العین ہے جو اسے دنیا کے دوسرے نظاموں سے منفرد اور الگ کرتا ہے۔ غیر خداوندی نظاموں میں جب ذرائع رزق، اور اسباب نشر و اشاعت معاشرہ کے کنٹرول میں ہوں تو افراد کی آزادی کا گلا گھٹ جاتا ہے، لیکن اسلامی نظام کے نصب العین کی بلندی انہی ذرائع کو افراد کی فکر و نظر کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ضامن بنا دیتی ہے۔ اسے نظام ربوبیت کہتے ہیں یعنی عالمگیر انسانیت کی طبیعی اور انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ذمہ دار نظام۔ ان تمام خرابیوں کی اصلاح کا یہی واحد طریق ہے جو آج کل دنیا میں ذرائع نشر و اشاعت کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

اور حسب ضرورت ہر قسم کی دیگر کتب کیلئے

ہماری خدمات حاصل کیجئے

کمل فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمایئے

ناشران

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

باب المراسلات

مرکزِ ملت

ہمیں بہت سے حضرات کی طرف سے یہ استفسار موصول ہوا ہے کہ "طلوعِ اسلام کے خلاف سب سے بڑا اچارج یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ مرکزِ ملت کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت ہوتی ہے، اور مرکزِ ملت سے مراد مرکزی حکومت، پاکستان یا اسی قسم کی اور حکومت ہے۔ اس بات کی وضاحت کی جائے۔

ہم اس کی وضاحت ایک مرتبہ نہیں متعدد بار کر چکے ہیں اور طلوعِ اسلام میں صراحت سے لکھ چکے ہیں کہ اس سے ہمارا مطلب کیا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں انداز یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جس کی مخالفت مقصود ہو اس کی صحیح بات لوگوں کے سامنے نہ آنے دی جائے۔ خود ہی اس کی طرف ایک غلط بات منسوب کر دی جائے اور پھر اسے ہدفِ لعن و تشنیع بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ آپ ایک بار پھر سن لیجئے کہ مرکزِ ملت سے ہماری مراد کیا ہے۔

عام مذاہب میں صورت یہ ہے کہ جن امور کو مذہبی احکام کہا جاتا ہے وہ چند اخلاقی ہدایات یا پوجا پاٹ کی رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے طور پر ان کی پابندی کرتے ہیں، بالفاظِ دیگر ان کے ہاں مذہب انفرادی چیز ہے۔ لیکن اسلام کا تصور اس سے مختلف ہے۔ اسلام ایک دین (نظامِ حیات) ہے جو ایک منظم اور اجتماعی شکل میں بروئے کار آتا ہے، دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ یہ ایک ایسی مملکت تشکیل کرتا ہے جس میں احکامِ خداوندی قانون کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مملکت کے قوانین کی اطاعت کے لئے کسی سنٹرل اتھارٹی کی ضرورت ہوگی جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کو ہم "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔

نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی جس کی سنٹرل اتھارٹی خود حضورؐ ہی تھے۔

آپ کے سوا اور ہو کون سکتا تھا؟ اس مملکت میں احکامِ خداوندی کی اطاعت سے مقصود ان قوانین کی اطاعت تھی جسے یہ سنٹرل اتھارٹی نافذ کرتی تھی یعنی صورت یہ نہیں تھی کہ قرآنی احکام پر جس طرح کسی نے جی چاہا عمل کر لیا ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف سے صادر فرمودہ فیصلوں کی اطاعت کرے۔ اسی کا نام "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت تھا۔

یہ نظام نبی اکرمؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ اس لئے حضورؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد بھی یہ اسی طرح قائم رہا۔ اسے "خلافت علی منہاجِ نبوت" کہا جاتا ہے۔ اس میں سنٹرل اتھارٹی، خلیفۃ المسلمین تھا۔ یہی وہ سنٹرل اتھارٹی (یا مرکزِ ملت) تھا جس کے فیصلوں کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم تھی۔ کسی کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ قرآن کریم یا نبی اکرمؐ کے کسی فیصلے پر اپنے طور پر جس طرح جی چاہے عمل کر کے کہے کہ میں خدا اور رسول کی اطاعت کر رہا ہوں۔ مثلاً جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا تو انفرادی طور پر کئی ایک صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا لیکن ان سب نے اطاعت اس سنٹرل اتھارٹی کے فیصلے کی کی۔ یا جب حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہ کی جائیں تو اکثر صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود عمل سنٹرل اتھارٹی کے فیصلے کے مطابق ہی ہوا۔ ظاہر ہے کہ جن صحابہؓ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف (جو بہرحال ان کے تفقہ فی الدین ہی کا نتیجہ تھی) مرکز کے فیصلہ کی اطاعت کی تو انہوں نے نہ تو (معاذ اللہ) طوعاً و کرہاً کسی مستبد حاکم کی اطاعت کی، اور نہ ہی ان کی یہ اطاعت (پناہ بخدا) "خدا اور رسول کی معصیت تھی۔ یہ بلکہ عین خدا و رسولؐ کی اطاعت کے مرادف تھی یعنی عامۃ المسلمین کے عمل کے لئے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا فیصلہ خدا اور رسول کے فیصلے کے مرادف تھا۔

جب بدقسمتی سے خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو دین کے نظام کا یہ نقشہ باقی نہ رہا۔ اس کی وہ سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی۔ اب وہ دیگر مذاہب کی طرح انفرادی سطح پر آ گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ امت میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے ـــــ سنٹرل اتھارٹی کی موجودگی میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ـــــ اب خدا اور رسول کی اطاعت کا عملی طریق اس کے سوا کوئی ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک فرقہ (یا اگر کوئی شخص کسی فرقہ سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا تو وہ فرد) اپنے طور پر قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کی پیروی کرے۔ یہ سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک دین کی وہی شکل مقصود تھی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافت علی منہاجِ نبوت میں قائم تھی اور دین اپنی وہی شکل اُس وقت اختیار کرے گا جب خلافت علیٰ منہاجِ نبوت دوبارہ قائم ہو۔ ہم اس کے

دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اسی کو ہم قرآنی حکومت۔ حکومتِ خداوندی۔ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کہتے ہیں، خواہ وہ (امت کے مشورہ سے) ایک فرد کی صورت میں ہو یا ایک مجلس کی شکل میں۔ اس مرکزِ ملت کے فیصلوں کی اطاعت، ہمارے نزدیک، اسی طرح خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف ہوگی جس طرح (مثلاً) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اس وقت افرادِ امت کو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ قرآن کریم، سنتِ رسول اللہ یا فقہ ائمہؒ پر اپنی صوابدید کے مطابق اپنے طور پر عمل کریں۔ اس وقت یہ سنٹرل اتھارٹی (یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت) کتاب و سنت و فقہ وغیرہ کی روشنی میں معاملۂ زیرِ نظر کے متعلق جو فیصلہ دے گی اس کا اتباع سب کے لئے ضروری ہوگا۔ اس سے امت میں وہ وحدت پیدا ہو سکے گی جو عہدِ رسالت مآب اور خلافتِ راشدہ میں تھی۔

یہ بات کہ قرآن کریم میں جہاں اس ضمن میں "اللہ اور رسول" کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد اسلامی نظام ہے۔ ہماری اختراع نہیں، یہ خیال متقدمین کا بھی تھا اور خود ہمارے زمانے کے مفسرین کا بھی ہے۔

مثلاً قرآن کریم کی ایک آیت ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ... (۸/۱)۔ اے رسول! تم سے پوچھتے ہیں۔ انفال کے متعلق۔ کہدو کہ انفال "اللہ اور رسول" کے لئے ہے۔ امام ابن جریر طبری (جن کی تفسیر کو امام التفاسیر کہا جاتا ہے) اللہ اور رسولؐ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

واولی ھذہ الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال ھی زیادات یزیدھا الامام لبعض الجیش او جمیعھم۔

"انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے"۔

یہاں انفال کے معنی سے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ "اللہ و رسول" کی تفسیر انھوں نے امام وقت لکھی ہے۔

(۲) امام رازیؒ نے آیت (۵/۳۳) انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ کے تحت میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفہ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل، قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے"۔

(۳) اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع به مایشاء۔

سعید بن سیب، حسن بصری اور ضحاک (علیہم الرحمۃ) نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے۔

(۴) یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاهد وعطاء والحسن البصری وابراهیم النخعی والضحاک وابوثور من شهر السلاح فی قبة الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر به وقدر علیه فامام المسلمین فیه الخیار۔

حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب مجاہد عطاء حسن بصری، ابراہیم نخعی ضحاک اور ابوثور علیہم الرحمۃ نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)۔

ان حضرات کے اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک "اللہ اور رسول" سے مراد امام وقت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ احکام، رسول اللہ کی ذات گرامی یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، آیہ انفال کے متعلق، اپنی تفسیر (ترجمان القرآن جلد دوم) میں لکھتے ہیں

مال غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اس کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مال غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے ریاست (یعنی اسٹیٹ) کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع وحرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔

آپ دیکھئے یہاں انھوں نے "اللہ اور رسول" کے معنی حکومت (یعنی اسٹیٹ) لئے ہیں۔

اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول (صفحہ ۴۶۵-۴۶۴) میں سورہ المائدہ کی آیت ۳۳ کا ترجمہ اور تفسیر یوں لکھتے ہیں۔ آیت یہ ہے۔

إِنَّمَا جَزَاؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ...... (۵/۳۳)

وہ اس کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ۵۵۔ ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں۔ یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں ۵۶۔

جن الفاظ پر ۵۵ اور ۵۶ نمبر دیئے گئے ہیں وہ ان کی تشریح حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

۵۵ زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی لئے اس نے اپنا رسول بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اس چیز کو جو زمین پر ہے امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ بادشاہ کے خلاف لڑائی (WAGING WARAGAINST IHE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے چاہے اسکی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو۔ ۵۶ یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تا کہ

قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اُلٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی حکومت یا اسلامی نظام ہے۔ اسی کو طلوعِ اسلام مرکز ملت یا خلافت علیٰ منہاج نبوت سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بات اس نے آج نہیں کہی وہ تشکیل پاکستان کے بعد سے اسے برابر دُہرائے چلا آ رہا ہے (مثلاً) ستمبر ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں "خدا اور رسول کی اطاعت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جسے بعد میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ "کتاب" اسلامی نظام" میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔

قرآن شریف کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ "اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مراد مرکز حکومت قرآن کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کا نافذ کرنے والا اور رسول اللہ کی امامتِ کبریٰ کو آگے چلانے والا ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ مرکز "خدا اور رسول" کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔

اور اس مضمون کی آخری سطریں یہ تھیں۔

یہ حصہ صرف ترتیب و تدوین قوانین کا ہے لیکن یہ قوانین کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ جو اسلامی نظام کا اصل ہیں جب تک ان کے نافذ کرنے والوں کی سیرت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہو جائے گی جو قرآن چاہتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اکثر ابواب ایسے ہیں جن میں مسلمان بادشاہوں نے وہی قوانین رائج کئے جنہیں ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں اور آج بھی کئی ایک اسلامی ممالک میں قوانین شریعت رائج ہیں، لیکن بایں ہمہ ان کی سلطنتیں نوع انسان کے لئے کبھی موجب رحمت نہ بن سکیں۔ ان قوانین نے اپنے صحیح اور مکمل نتائج اس وقت پیدا کئے تھے جب یہ دنیا میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے نافذ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا نظام وہی نتائج پیدا کر رہا ہے یا نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھل رہی ہے یا نہیں۔ سیرتِ محمدیہ معراجِ انسانیت ہے۔ اور اس کی اصلی تصویر قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اُمید ہے اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ "مرکز ملت" سے ہماری مراد اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم اس حقیقت کو اس سے قبل کئی بار طلوع اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ جو حضرات ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ہاں طلوع اسلام جاتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر نہیں کہ "مرکز ملت" سے ہماری مراد کیا ہے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ طلوع اسلام کے نزدیک ہر فاسق و فاجر حکومت کی اطاعت (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) "خدا اور رسول" کی اطاعت ہے۔ آپ ہی فرمایئے کہ ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق کیا ہیں

اور

اُن کے فرائض کیا؟

ہے

قرآن نے انھیں معاشرہ میں کونسا مقام عطا کیا

ان تمام امور کے متعلق

طاہرہ کے نام خطوط

ہر دو جلدیں دیکھئے

اس میں سلیس، سادہ اور دل کش انداز میں مختلف موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے اس انداز کی دوسری کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ قیمت۔ جلد اول ۲/۰ روپے۔ جلد دوم ۲/۸

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

باب المراسلات

دُوسری بیوی

ایک محترمہ خاتون لکھتی ہیں کہ تعدد ازدواج کے سلسلہ میں جو کچھ عام طور پر لکھا گیا ہے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے عائلی قوانین کو بھی دیکھا ہے۔ طلوع اسلام میں اس ضمن میں جو کچھ شائع ہوا ہے، وہ بھی میری نظر سے گذرا ہے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک عورت کے نقطۂ خیال سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی زحمت کسی نے نہیں اٹھائی۔ سوال یہ ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں جب دوسری بیوی لائی جاتی ہے تو پہلی بیوی پر اس سے کیا گزرتی ہے؟ ایک وفاشعار بیوی کے نزدیک دنیا کی سب سے قیمتی متاع اس کا خاوند ہوتا ہے اور وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ اس کی اس متاع میں کوئی دوسرا شریک ہو۔ آپ اسے رقابت کہہ لیجئے۔ حسد کہہ لیجئے۔ اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورت اسے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید آپ یہ کہیں کہ دوسری بیوی اسے کس طرح برداشت کر لیتی ہے؟ تو یہ اس لئے کہ وہ سمجھتی ہے کہ میں اس متاع کو اُس پہلی بیوی سے چھین کر اپنے قبضے میں کر رہی ہوں۔ نیز وہ پہلی بیوی کے سر پر چڑھ کر آتی ہے اس لئے اس کا جذبہ برتری بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ پہلی بیوی سے اس کی متاع بھی چھنتی ہے اور اس کے جذبہ برتری کو بھی سخت ٹھیس لگتی ہے۔ اس دوسری بیوی سے اُس وقت پوچھنا چاہیئے جب اس کے اوپر ایک اور بیوی آجائے۔ اصل یہ ہے کہ دوسری بیوی کے آنے سے، پہلی بیوی اپنے آپ کو دھتکاری ہوئی اور پھینک دی ہوئی شے سمجھنے لگتی ہے۔ اور اس کی پوزیشن بھی ایسی ہی رہ جاتی ہے۔ اس لئے یہ احساس اسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتا۔ وہ اسے برداشت اس لئے کر لیتی ہے کہ وہ بے حد مجبور اور بے آسرا ہوتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسی صورت میں طلاق لے سکتی ہے۔ لیکن آپ سوچئے تو بھی کہ وہ طلاق لے کر کرے گی کیا اور جائے گی کہاں؟ دوسری بیویاں عام طور پر اس وقت لائی جاتی ہیں جب پہلی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو چکی ہو۔ آپ سوچئے کہ اس عمر کی عورت، جس کے چار پانچ بچے بھی ہیں، طلاق لے کر کہاں جائیگی؟ اس لئے وہ اس جہنم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتی ہے۔ نیز طلاق کے لئے کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ یہ تھوڑا ہے کہ اچھی بھلی بیوی سے یہ کہا جائے کہ یا سوت قبول کر یا طلاق لو۔

آپ کہتے ہیں کہ نکاح کی بنیادی شرط یہ ہے کہ میاں بیوی میں خیالات اور مزاج کی یکسانی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو گھر جہنم بن جائے گا۔ میں دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ جب ایک مرد، اپنی پہلی بیوی کے باوجود، دوسری بیوی لاتا ہے تو کیا اس پہلی بیوی اور اس کے خاوند میں، خیالات اور مزاج کی یکسانی باقی رہ جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔ سو اگر نکاح کی بنیادی شرط خیالات وغیرہ کی یکسانی ہے تو اس جوڑے کی باقی زندگی میں

یہ شرط کہاں باقی رہ جاتی ہے ؟ کیا جس شرط کی ضرورت شادی کی ابتدا میں تھی، آگے جا کر اس شرط کی ضرورت باقی نہیں رہتی ؟

آپ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کا حکم ہے کہ جب تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جانے کا اندیشہ محسوس ہو تو تم ثالث مقرر کر کے، ان میں مصالحت کی کوشش کرو۔ اور اگر دیکھو کہ ان میں مصالحت کا امکان نہیں تو انہیں علیحدہ کر دو۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسری بیوی لاتا ہے تو پہلی بیوی کے ساتھ اس کی ناچاقی میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے ؟ ایسی صورت میں، یہ ثالث ان میں مصالحت کی شکل کیا پیدا کر سکتے ہیں۔ بس یہی کہ عورت کو سمجھایا (بلکہ ڈرایا) جائے کہ اپنے خاوند سے لڑائی مول لے کر تم کس طرح گزارہ کر سکتی ہو۔ اور طلاق لے کر کہاں جاؤ گی۔ لہٰذا تمہارے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ تم "آرام چین" سے اس گھر میں رہو۔ کیا مصالحت اسی کو کہتے ہیں ؟ اور کیا اس سے یہ گھر واقعی جنت کا نمونہ بن جائے گا اور اس عورت کی زندگی واقعی آرام چین سے گزرے گی ؟

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض علاقوں میں ایک سے زیادہ بیویوں کا عام طور پر رواج ہوتا ہے۔ وہاں عورتیں اس کا خیال بھی نہیں کرتیں۔ اگر یہی دلیل ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے کہ بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔ اور مرد اس کا خیال تک بھی نہیں کرتے ؟ تو کیا اس رواج سے آپ کے نزدیک یہ چیز درست قرار پا جائے گی ؟ یہ بات تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ جو صورت افراد میں پختہ "عادت" کی ہوتی ہے وہی شکل قوموں میں رواج کی ہوتی ہے۔ نہ "عادت" پوری کرتے ہیں، سوچ بچار۔ عقل و فکر اور جذبات و احساسات کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ وہ خود بخود سرزد ہوتی جاتی ہے۔ نہ رواج پر عمل کرنے میں غور و فکر کو کام میں لایا جاتا ہے۔ رواج تو ایک رو ہوتی ہے جس میں سب بہے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا رواج کوئی سند یا دلیل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر پوزیشن یہ اختیار کر لی جائے کہ عورت کی اپنی حیثیت کچھ نہیں اور یہ مرد کی مرضی کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اسے اس کا حق ہی نہیں کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کی رعایت طلب کرے یا اپنے کچھ حقوق سمجھے۔ تو اس صورت میں مرد خواہ دوسری شادی کرے اور خواہ اسے دھکے دیکر نکال باہر کرے یہ سب ٹھیک ہوگا۔ لیکن اگر حقیقت یہ ہے کہ عورت کی بھی کوئی پوزیشن ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے اور اس کے دل کا احترام بھی ضروری ہے۔ تو پھر پہلی بیوی کے سر پر دوسری بیوی لے آنا، ایک وفا شعار، عورت پر اتنا بڑا ظلم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

یہ میرے دل کی ایک خلش ہے جسے میں نے اس طرح آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ کیا آپ میرے

اطمینان کی کوئی صورت پیدا کر دیں گے۔؟ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔

طلوع اسلام

عزیزہ بہن! ہمیں عورت کے ان جذبات کا پورا پورا احساس ہے جن کی ترجمانی آپ نے اس عمدگی سے کی ہے۔ لیکن جن حالات میں قرآن کریم نے تعدد ازدواج کا ذکر کیا ہے انہیں سمجھ لینے اور پیش نظر رکھنے کے بعد اس قسم کے خدشات کا امکان نہیں رہتا۔ یاد رکھئے! جس خدا نے قرآن نازل کیا ہے، وہ مردوں اور عورتوں، دونوں کا یکساں خدا ہے۔ اس لئے اس میں (معاذ اللہ) ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ وہ مردوں کی رعایت سے، عورتوں کے جذبات کو کچل کر رکھ دے۔ اس نے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی صف میں رکھا ہے۔

ہم لوگ جنگ کے حوادث سے محفوظ رہے ہیں (یہ غنیمت ہے) اس لئے ہمیں اس کا عملی تجربہ نہیں کہ جنگ میں حالات کس قدر غیر معمولی ہو جاتے ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے کس قسم کی غیر معمولی تدابیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ تدابیر ہی غیر معمولی نہیں ہوتیں بلکہ اس دوران میں، قوم کے جذبات بھی، عام جذبات سے ہٹ کر غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف نفرت اور انتقام کے جذبات انتہائی شدت اختیار کر جاتے ہیں تو دوسری طرف ایثار اور ہمدردی کی بھی ایسی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں جو عام حالات میں ناممکنات میں سے تصور کی جائیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے انسانوں کی "فطرت" بدل گئی ہو۔

ایسے ہی تھے وہ حالات جن سے، صدر اول کے مسلمانوں (رضی اللہ عنہم) کو مدنی زندگی میں گزرنا پڑا — اور برسوں تک مسلسل اور پیہم گزرنا پڑا۔ مختصر سی جماعت اور پیہم لڑائیاں۔ نتیجہ یہ کہ قوم میں بیوگان اور یتیموں کی کثرت ہو گئی۔ اُدھر مکہ سے مسلمان خواتین نے ہجرت کر کے اِدھر آنا شروع کر دیا۔ اس طرح بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئیں اور مرد کم رہ گئے۔ یہ عورتیں نہ کفار اور مشرکین کے نکاح میں جا سکتی تھیں نہ اہل کتاب کے — یہ مسلمانوں کے گھروں ہی میں جا سکتی تھیں۔ یہ ایک ہنگامی مصیبت تھی جس سے قوم کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ بے شوہر کی عورتیں اور بچے، قوم کا جزو تھے۔ اس لئے ان کی مصیبت، قوم کی مصیبت تھی۔ اس قوم میں جس کی یہ مصیبت تھی مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں شامل تھے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی فکر جس قدر مردوں کو تھی اُسی قدر عورتوں کو تھی۔ بلکہ عورتوں کی ہمدردیاں اپنی ان مظلوم اور بے آسرا بہنوں کے ساتھ اور بھی زیادہ ہونگی۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان عورتوں اور بچوں کو مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا جائے۔ ان حالات میں، قرآن کریم نے "ایک بیوی" (Monogamy) کے اصول میں استثنار کی اجازت دی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں اکثر تو ایسا ہوا ہوگا کہ مومن عورتیں، اپنی ان مظلوم بہنوں کو خود اپنے گھروں میں لے آئی ہوں گی۔ اور جن گھروں کی عورتیں اس پر رضامند نہیں ہوئی ہوں گی

وہاں ان کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے یہ کہہ دیا کہ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (۴/۳) ــــ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو ــــ تو پہلی بیوی کی مرضی اور منشاء کے خلاف دوسری بیوی لانے میں عدل کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو عورتیں ان گھروں میں آئی ہوں گی ان کے دل میں بھی ان خیالات کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا جنہیں لے کر، آجکل ہمارے ہاں دوسری بیوی آتی ہے۔ نہ ہی پہلی بیوی کے دل میں حسد و رقابت کے جذبات بیدار ہو سکتے ہیں یا احساس کمتری پیدا ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ تم عورتوں میں قلبی یکسانیت (عدل) کا سلوک کر سکو۔ لیکن ایسا نہ کرنا کہ ایک بیوی کی طرف اتنا جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹)۔ ہمارے ہاں تو، دوسری بیوی کی صورت میں، پہلی بیوی کی یہ حالت ہو جاتی ہے، لیکن جن حالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان میں اس تاکید کی ضرورت، اس لئے پیش آئی ہو گی کہ مبادا دوسری بیوی کی یہ حالت نہ ہو جائے۔

قرآن کریم نے ان حالات میں "ایک بیوی" کے قانون میں استثناء کی اجازت دی ہے۔ کہدیا جا سکتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ ان خصوصی اور ہنگامی حالات میں نہ پہلی بیوی کے دل میں جذبات حسد و رقابت بیدار ہو سکتے ہیں نہ دوسری کے دل میں احساس برتری پیدا ہو سکتا ہے، تو یہ خوش فہمی ہے۔ لیکن یہ خوش فہمی نہیں۔ قرآن کریم، مومنین کی جو صفات بیان کرتا ہے آج ان میں سے ہیں ایک ایک چیز اچھا نظر آتی ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ محض شاعر کا خواب (UTOPIA) ہے۔ انسانوں میں اس قسم کی قلب ماہیت ہو نہیں سکتی۔ لیکن قرآن کریم حقائق بیان کیا کرتا ہے۔ شاعروں کے خواب بیان نہیں کیا کرتا۔ ہمیں وہ باتیں اس لئے اچھا نظر آتی ہیں، کہ ہم اس قلبی تبدیلی سے آشنا نہیں جو ایمان کی رُو سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم مومنین کی یہ صفت بتاتا ہے کہ وہ خود تنگی میں گزارہ کرتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ سن کر فوراً کہہ اٹھیں گے (اور اگر ایسا کہنے کی جرأت نہ بھی کر سکیں تو دل میں ضرور کہیں گے) کہ ایسا ہونا عملاً ناممکن ہے۔ یہ انسان کی "فطرت" کے خلاف ہے۔ لیکن قرآن، ناممکنات کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس لئے یہ بالکل ممکن ہے۔ یا (مثلاً) وہ کہتا ہے کہ تم ہمیشہ سچی گواہی دو خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے ہمیں یہ بات ناممکن سی دکھائی دیتی ہے۔ ہم باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص خود اپنے خلاف بھی گواہی دے سکتا ہے۔ لیکن، ایمان، انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ اندریں حالات، جب ہم کہتے ہیں کہ ان مومن عورتوں نے، ایسے ہنگامی حالات میں، اپنی مظلوم اور بے آسرا بہنوں کی باعزت حفاظت کا سامان

تو کیا ہوگا اور اس سے گھروں میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی ہوگی، تو یہ محض "خوش فہمی" نہیں۔ ایمان ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو کیا آپ باور کر سکتی ہیں کہ قرآن ایسی شکل پیدا کرنے کی اجازت دیدیتا جس میں بے آسرا عورتوں کی پناہ دہی کے لئے بستے رستے گھروں کو اجاڑ دیا جائے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ (خواہ ہنگامی حالات کیسے ہی کیوں نہ نمودار ہو جائیں)، جس دوسری شادی میں پہلی بیوی کی دل آزاری ہوتی ہو، اُس سے گھر کے اجڑ جانے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ایسی شادی جس میں پہلی بیوی کا دل دُکھے، کیا حیثیت رکھتی ہے، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگ سکتا ہے کہ

"ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپ نے مسجد میں خطبہ دیا، اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی۔ فرمایا۔ "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دُکھ پہنچے گا، مجھے بھی اذیت ہوگی۔" چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہ کیا۔

(سیرۃ النبی، مولانا شبلی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۲۷۔ بحوالہ بخاری)

امید ہے ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ آپ کے دل کی خلش ہمارے ہاں کے غلط رواج کی پیدا کردہ ہے جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم (اور رسول اللہؐ کا مندرجہ بالا عمل) حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

جمع القرآن

کیا قرآن کریم کو خود نبی اکرم (صلعم) نے جمع کرا دیا تھا یا اسے بعد میں جمع کیا گیا۔ اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب ——— قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ　میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

مسلمان کی زندگی

اکتوبر ۱۹۳۹ء

پرویز

پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ "فردوسِ گم گشتہ" ایک مدت سے نایاب ہے۔ اس کے جدید ایڈیشن کی تیاری کی جا رہی ہے لیکن اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اس مجموعہ میں طلوعِ اسلام کے دہلی کے دور کے مضامین بھی شامل تھے۔ اکثر احباب جنھوں نے اُس دور کے مضامین دیکھے تھے مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ جب تک فردوسِ گم گشتہ کا تازہ ایڈیشن شائع نہ ہو ان مضامین میں سے چیدہ چیدہ طلوعِ اسلام میں شائع کئے جائیں۔ زیرِ نظر مضمون کے لیے بعض احباب نے خاص طور پر کہا ہے۔ ان کی فرمائش اور عام تقاضا کے پیشِ نظر ہم اس مضمون کو ملخصاً شائع کر رہے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

انسان پر جب مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ ظلمت کدۂ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی۔ تمام اسباب و علل ایک ایک کر کے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذرّوں سے اُبھرتے چلے آتے ہیں وہ ان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اُسے مسلسل مصائب و تکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اسے ایک بے کس و بے بس و مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور و ستم اور ظلم و استبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لیے اس وحشت ناک کرہ میں بھیجا ہے۔ چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اُسے دیکھے، اس لیے جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت و شادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ متبسم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے اور وہ ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے، خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آن ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ

ہے۔ لہٰذا سکون و اطمینان عدم آزادی میں ہی ہے۔ (مہاتما بدھ)

وُہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو و باطل شے قرار دیتا ہے۔ وُہ سمجھتا ہے کہ "زندگی محض سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ مایا کا جال ہے۔" (اپنشد) وُہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے" (شوپنہار) وُہ اس مصیبت کدہ سے دُور بھاگنا چاہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چونکہ وُہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں، اس لیے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور عام انسانوں میں سے چونکہ صاحبانِ ثروت و اقتدار کو وُہ اپنی لُٹی ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے اس لیے دولت و ثروت، شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے۔ وُہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دُور جنگلوں میں جا کر بسیرا کر لیتا ہے۔ اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے وُہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ مجروح کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کریں "آسمانی بادشاہت" میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا وُہ ستم رسیدہ، کمزور، ناتواں، ضعیف، مغلوب و مقہور انسانوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لیے نہیں ہے اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں۔ البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں دولت و حشمت کے مالک ذلیل و خوار ہوں گے، اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہی مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہے۔ نروانا میں یم کے مقرب یہی لوگ ہوں گے۔ دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کنیسہ و صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی اور تیاگی بھگشو کا سچا دھرم ہے۔ اس فلسفہ اور مشرب کی لم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزین بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں، عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی، یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوش حال۔ اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو۔ وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھائے کہ یہ اُسے وہاں کی ابدی مسرتوں کا پیام دے رہے ہوں۔ غرضے کہ وُہ دنیا و آخرت کے درمیان، ایک ایسے ناقابلِ شکست آئینہ کی سدِ سکندری قائم کر دے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم، فطرت کی تعلیم قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانے میں عمر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقعہ یہی منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کر دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا

دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت و ملامت ہیں؟ کیا یہاں کی ہر سہاؤنی شے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا مقصدِ حیاتِ انسان ذلت و رسوائی، محتاجی و ناداری، نکبت و مسکنت، افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ پھر کیا ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم، یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضے میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی دبکتی، دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت، عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہوگی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا بابِ السلام قطعاً مسدود ہوگا؟ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے؟ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب، آپ اپنے دماغ سے کہ جس پر ایک عرصۂ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، نچھ ہی دیجئے اور اس سے مطمئن ہو جایئے لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے۔

قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۴۵/۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سموات) میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے۔ فطرت کی ہر چیز سے کام لے کہ ایک مدتِ معینہ تک یہ سب اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدائے تعالیٰ نے قطعاً حرام نہیں کیں (۷: ۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لیے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳: ۱۴) ان سے فائدہ اٹھانا، ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے انسانوں کی معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہمارے اجتماعی نظام میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت و پستی کی بھی تو انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انبیاء کرام کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کے لیے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام، جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا

اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لَے رہی ہے یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت و سطوت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے، اور انھیں ایسی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وُہ عیوب پیدا نہ ہوں جو "مترفین" میں پیدا ہو جاتے ہیں دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظامِ انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا حضرت انبیاء کرامؑ جن مستضعفین کو ابھار کر بلند سطح پر لاتے تھے انھیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا! تم نے حدود اللہ کی نگہداشت کرنا ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وُہ قوانین الٰہی سے مُنہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کر دیتے تھے، جس سے ان کے اور خُدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے۔ بس یہ ہے خلاصہ آسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کے لیے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کا نام دُنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ میزانِ خُداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وُہ زمین سے اُبھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وُہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر نعمائے آخرت خُدا کا انعام ہیں تو دُنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں، اور یہ وُہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت ثمودؑ نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ خُدا کی اس نعمت و قُدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمھیں قومِ نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور تمھیں قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہٰذا

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷ : ۶۹)

اللہ کی یہ قُدرت یاد کرو تاکہ تمھیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قومِ ثمود سے کہا۔

تم خُدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قومِ عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محفوظ) عمارات تعمیر کرتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو اور زمین میں فساد مت پیدا کرو! (۷ : ۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اور اس نے تمھیں کثرت عطا فرمائی (۸۶ : ۷)۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۲۲ : ۱۶) اور آلِ ابراہیم۔ کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ "ملکِ عظیم" کی بھی مالک بنائی گئی (۵۴ : ۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر ابتلاء و آزمائش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ تمکن فی الارض تھا اور اس عطیۂ کبریٰ کو ان کے صبر و تقویٰ کا اجر جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحبِ حکومت بنا دیا۔ (متمکن فی الارض کر دیا)

جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (۱۲/۵۶)

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تمام داستان اسی قوت و حشمت و تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس شدت و تکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، کوئی اور واقعہ اس شد و مد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں، اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنا دیں اور ان کو ملک کا وارث قرار دیں، اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کر دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ (۲۸ : ۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف و ناتواں، اسی محکوم و مغلوب قوم کو بالآخر مشارق و مغارب کا حکمراں بنا دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭوَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭوَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۷ : ۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا اور تمہارے رب کا وعدۂ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لیے حضرت موسیٰؑ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدائے تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے

چاہے (اپنے قانون کے مطابق) اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کے لیے ہے۔ (۷:۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی ہے۔

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا۔ اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی

(سورۃ بقرہ و دیگر مقامات)

اور جب اسی قوم نے قوانینِ الٰہی سے سرتابی اختیار کر لی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۲/۶۱)

اور ان پر ذلت اور مسکینی کی مار مار دی گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

مذکورۂ صدر قصص، قرآن کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم امم گزشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر سے دیکھو کَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ جن قوموں نے قوانینِ الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے، کیوں کہ اخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے آ نہیں سکتا۔ ان میں سے بہت سی قومیں تو قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ (۲۳:۴۴) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں) مگر ان کی حالت، عبرت و عظمت کی زندہ داستان ہے۔ پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا غضب اور عذاب ہے۔ مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ "تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا بادشاہ بنائے گا" (۲۴:۵۵) کہیں یہ تشریح ہے کہ جو کوئی عمل صالح کرے گا۔ وہ مرد ہو یا عورت شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو خوش گوار زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے" (۱۶:۹۷)، جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے (۱۶:۴۱) جو اس کے دیئے ہوئے

کی قدر کرتا ہے، اپنی قوتوں اور اس کی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے کہ یہی عملاً شکرِ نعمت ہے، اللہ ان نعمتوں میں اور زیادتی کرتا جاتا ہے۔ (۷، ۱۴) برعکس اس کے "جو قوانینِ خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے، ان قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے۔ وہ خود بھی منزلِ مقصود تک لے جانے والے راستہ سے بہک جاتا ہے۔ اور دوسروں کو بہکاتا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذابِ حریق ملے گا" (۸: ۲۲) اسی طرح جو خدا کے قوانین اس طرح سے ملنے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے اختیار کرے اور جس میں کسی قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی طبع سہولت پسند پر گراں گزرے اور وہ اس سے پہلو تہی کرے اس کے لیے بھی خزی فی الحیوٰۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے (۲: ۸۵) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں۔ ان اعتقادوں کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لیے ایک دستورالعمل، ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا کہ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوامِ گذشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا۔ ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۹۶:۷)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے نظامِ تقویٰ اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائے گا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا اور تمہاری کوتاہیوں سے درگزر کرے گا اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے (۸: ۲۹)

اس لائحہ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جد و جہد، غیر منقطع سعی و عمل، ان تھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت، پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسن عمل، اپنے اعمالِ صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی، محتاجی و فلاکت کی زندگی، مجبوری و بے بسی کی زندگی، کہ جسے قرآن نے غضبِ خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا، نصیبِ اعدا کر کے، خود عزت و وقار کی زندگی، خوش حالی و خوش بختی کی زندگی، عظمت و شوکت کی زندگی، حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا کہ یہی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالح کرنے والی جماعت کی حیاتِ طیب ہو سکتی تھی۔ ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل اپنے اللہ سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا (۲: ۲۰۱) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوام

عالم میں سے وراثتِ کتاب کے لیے منتخب کر لیا تھا (۳۲ : ۳۵) جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین اُمت قرار دیا تھا (۳ : ۱۰۹) ایسے عباد صالح بننا تھا جن کے لیے وراثت ارضی مقدر ہو چکی تھی (۲۱ : ۱۰۵) اور عملاً بتا دینا تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لیے ایک عظیم الشان پیغامِ موعظت ہے۔ بلاغِ مبین ہے (۲۱ : ۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا تھا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰ : ۶۴)

ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی یہ قانونِ الٰہی غیر متبدل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں، بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ (۴۰ : ۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکانِ ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے (۲ : ۴۵) کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر کثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے (۸ : ۴۸) الغرض انھیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں صرف مومنین کے لیے ہیں، مجاہدین کے لیے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹ : ۸۸) "اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں" انھوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دیئے جو ان سے کئے گئے ہیں۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا (۳۳ : ۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی کہ جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لیے ان کی نظروں میں انھیں دشمن تھوڑے دکھائے جاتے (۸ : ۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں کہ جس سے یہ انھیں زیادہ دکھائی دیں۔ (۸ : ۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی کہ جن کو کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا (۸ : ۱۲) کبھی ان میں کا ایک ایک دو دو پر

پر بھاری ہوتا (۸:۶۶) کبھی دس دس پر (۸:۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ اس کی لپٹی ہوتی۔ (۸:۱۷) ان کے مقابلے میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی اور نہ قوت اس لیے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے، اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ میں اور ہر میدان ان کے قبضے میں ہوتا، اور اس طرح بتا دیا جاتا کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے چنانچہ اس وعدے کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تیز و تند مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجرِ طیب کی طرح یوں بڑھا، پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

> محمدؐ اللہ کے رسول، اور ان کے ساتھی، کفار کے مقابلہ میں سخت آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا۔ کبھی رکوع کر رہے ہیں، کبھی سجدوں میں پڑے ہیں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں، ان کے آثار بوجہ تاثیرِ سجدات ان کے چہروں پہ نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں، اور انجیل میں ہیں جیسے کھیتی کہ جس نے پہلے اپنی سوئی نکالی۔ پھر وہ درست ہو کر اوپر کو ابھری۔ پھر وہ اور موٹی ہوئی۔ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ کہ (اسے دیکھ دیکھ کر) کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے اور اس سے حاسدین جل جائیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا۔ (وہ یوں پورا ہو کر رہا)۔ (۴۸:۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ صحیح مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے اور وہ وقت انھیں یاد آتا جب وہ قلیل تھے۔ ملک میں کمزور و ناتواں شمار کئے جاتے تھے، اس اندیشہ میں رہتے کہ مخالف انھیں اچک کر نہ لے جائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انھیں قوت دی اور ان کو نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے شکر گذار بندے ہیں" (۸:۲۶) تو مسرت کے سجدے تھے جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ

> یہ وادیٔ ضجنان وہی ہے جس میں میں ایک ادنیٰ کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تھے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں۔

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادت کا صحیح مفہوم، اعمالِ صالح کی سچی تفسیر، دُنیا اور آخرت کا اصلی تعلق، قرآنِ کریم کا عملی نظام، اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر، ہر مُسلمان کے سامنے تھی جلد ختم ہوگیا خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں نمودار ہوگئیں، اور اس کی انتہا عہد عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب تھا اور رُوح یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ حکومت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں۔ وُہ مجاہدانہ زندگی جو قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی، اب بیگار کے بھرتی شدہ، مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرم جوشی کی وُہ فاروقی رُوح، جو خالد ابنِ ولید کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اُٹھتی تھی (حالاں کہ وُہ میدانِ جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے انھوں نے ایسا کیا تھا)، اب عہدِ کہن کا افسانہ بن چکی تھی۔ تقسیم عمل سے عملی رہبانیت پیدا ہو چکی۔ یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامت اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی۔ اسلام کی مرکزی قوت فنا ہو گئی، اجتماعیت کی شان بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات اب مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے۔ قوتیں سلب ہو چکی تھیں، حوصلے پست ہو گئے تھے۔ دُنیا ہاتھ سے نکل گئی، عزّت و وقار کی جگہ ذلت وپستی آ گئی، شوکت وحشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مناسک وشعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب اس کے نتائج وُہ نہ تھے جو اس وقت مترتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں اور اس قسم کے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا، ہمارے اعمال کے سزا کی مُدّت ختم ہونے والی ہوتی تو نگاہ کا رُخ اس طرف جاتا کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال، جن کی شکل اسلامی ضرور ہے، اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح نہیں ہو سکتے، جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہد مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں ہوئے تھے۔ لیکن بدبختی کو ناد یدہ نگاہ اُلٹی طرف بدلا۔ قرآن کریم جہاں جہاں کامیابی فلاح، سرخروئی، فوزِ عظیم، رزقِ کریم، حسنِ مآب مومنین کے لیے مخصوص کیا تھا، ان سب کو آخرت کی زندگی سے متعلق کر دیا گیا اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا کہ جس کا نتیجہ اس دُنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود عقیدہ کی شدّت اور صوم وصلوٰۃ تسبیح وتہلیل کی پابندی کے دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات
وُہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست　　　یہ مذہبِ مُلّا وجمادات ونباتات

اس وقت بجائے اس کے کیوں سمجھا جاتا، کہ ان الفاظ و اعمال کی رُوح ان سے مفقود ہو چکی ہے اس لیے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو یوں فریب دے لیا کہ یہ تمام اعمال رائیگاں نہیں جا رہے۔ البتہ ان کا نتیجہ اخروی زندگی میں برآمد ہو گا۔ غیر مسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا، انہیں اپنے لُٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے۔ اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابتلاء کی زندگی ہے، جس میں انہیں مُہلت دی گئی ہے۔ اخروی زندگی میں ہم جنتِ جاودانی اور یہ جہنمِ ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفۂ ترکِ علائق یونانی مشائین کی حکمت ترک کر دینا، ہندو مت کا سنیاس، بدھ دھرم کا سنسار تیاگ، ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا ترکِ دُنیا، ترکِ علائق، ترکِ لذائذ حتٰی کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خط و خال قرار پا گئے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ۔۔۔ بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور ۔۔۔ کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی ۔۔۔ اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست (اقبال)

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی حالت سے محترز رہنے کے لیے تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں دولت و ثروت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ تمہاری منزلِ مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآن کریم میں ایسی تعلیم تھی، اسے دنیاوی متاع و اسباب سے نفرت دلانے کے لیے بطور نص صریح پیش کرنے لگے۔ یعنی طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لیے سر پہ برف رکھنے کی تاکید کی تھی کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دُنیاوی زیب و زینت کو قرآن کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا۔ وُہ سب حرام قرار پا گئیں۔ چیتھڑے پہننا، بھوکے رہنا، خراب و خستہ ہونا، بے گھر بے در زندگی بسر کرنا، "خدا کے بندوں" کی علامات متصوّر ہونے لگیں۔ غرض کہ ایک ایک کر کے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جس کو روکنے کے لیے اسلام دُنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا۔ (۵۷/۲۷) اسلام رہبانیت کا اس لیے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام افراد کی اصلاح اس لیے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد کا تزکیہ نفس ضروری ہے اس لیے کہ ان افراد کے

مجموعہ سے جو قوم مرتب ہو گی وہ مزکی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے۔ جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ یاقوت اور الماس کے بیرنوں پر قائم ہو، خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو۔ لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے وابستہ نہ ہو تو اس مشینری کے لیے ایسے پرزے کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس کا فی ذاتہٖ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین اسی قسم کی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہؐ اور صحابہؓ کبارؓ کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ایک ذہنیت کے بدل جانے سے اس تمام تعلیم کی روح بدل گئی اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالمِ اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ اسلام کی تمام شوکت و حشمت، ذلت و مسکنت میں بدلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم، جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا، یاس و حرماں کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے اور چونکہ وہی تعلیم جو اس واماندگی، ضعف و ناتوانی، پریشانی و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اہلِ اسلام بن چکی ہے، لہٰذا عوام تو اس نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں، جونہی آنکھیں بند ہوئیں اور ہم جنتِ جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب ان کے "دین" کا نتیجہ ہے، اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ "دین" کے علمبرداروں کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں، اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین دار لوگ دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے، اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے۔ لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی خلیجِ جہل، ایک ایسی گہری خلیج حائل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں یعنی دین اور دنیا کو، ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔

جہاں تک دین کی خدمت کا تعلق ہے اس کے لیے بھی ایسے ایسے انداز سامنے آتے ہیں جن کا تعلق نہ دین کی سرخروئی سے ہے نہ امت کی سرفرازی سے مثلاً آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ "ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیئے یا کہنی چاہیئے۔ ہزارہا روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دیئے جاتے ہیں۔ جماعتِ مخالف کے ائمہ و مشائخ، علماء و سلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں دونوں اطراف سے ہزارہا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دینے والے اسے "فی سبیل اللہ"

سمجھ کر دیتے ہیں۔ لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ غور سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لیے تخلیق کر کے اسے انسان کے لیے مسخر کر دیا۔ پھر ان انسانوں میں سے اُمتِ مسلمہ کو خیرِ امت کہہ کر اس مقصد کی تحصیل کے لیے انھیں چن لیا۔ تو کیا وُہ مقصدِ عظیم، وُہ نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتباء و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا، اس کا حصول، اس کا دارومدار اس قسم کی بحثوں اور مناظروں پر تھا یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کا تعلق اس دنیا کے معاملات کے ساتھ سمجھا نہیں جاتا۔ فلاح و سعادت کو محض اخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے سے مطلب ہی یہی ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان حسنِ مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، استخلاف فی الارض نہ ہو۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا کوئی تبدیلی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود　　ایں زمین و آسمان دیگر شود

قرآن کریم میں ہے :-

یہ اعمالی لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے عملِ صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے یہ بہت بُرا فیصلہ ہے۔ (جو یہ کئے بیٹھے ہیں)۔ (۴۵ : ۲۱)

یعنی قرآن کریم کی رُو سے ایک مومن و صالح کی زندگی، ایک بداعمال کی زندگی کے برابر نہیں، بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیئے۔ یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے، اور جو اس کے خلاف سمجھے وُہ سراسر غلطی پر ہے۔ لیکن کیا واقعی آج ہماری زندگی، بداعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعاتِ تو اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے تو عمال و ایمان کے سلسلہ میں، رزقِ کریم، عزت و آبرو کی کسوٹی (۵۰ : ۲۲) دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر آج یہ کیوں ہے، کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے۔ یہ محض زیبِ داستان نہیں۔ بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے، ذلت و خواری کی وُہ منازل طے کرنی پڑتی ہیں۔ جن کے تصور سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ یہ ساری خرابی اس نظریئے کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانے میں پیدا ہوا، اور جس کی رُو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے، اور وُہ یہ کہ مسلمانوں کو

جگا جگا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو دُنیا کی ذلت و خواری خُدا کا عذاب ہے۔ یہاں کی شوکت و حشمت کی زندگی عین اسلامی زندگی ہے۔ مُسلمان دُنیا میں ایک امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزّت و وقار، جاہ و سطوت، سربلندی و سرفرازی، اس کے اعمالِ صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو، ان کی رُوح ہرگز اسلامی نہیں۔ جو یہاں ذلیل ہے اور ذلت پر قانع ہے وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷ : ۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وُہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

لہٰذا آج کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کی تصویر مسلمانوں کو دکھا کر انھیں بتایا جائے کہ اسلام دُنیا و آخرت دونوں کی کامرانیاں دینے کے لیے آیا تھا۔ دُنیا کو ذلیل و حقیر سمجھنا غیر اسلامی تصوّف ہے۔ آپ ایک دفعہ اس "اسلامی رہبانیت" کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آیئے۔ پھر دیکھئے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پُوچھنا ہی کیا۔ جب خُدا کی کتاب زندہ ہے، اس کے اندر اس کے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ زندہ ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اس قوم کو ہے کہ بقا للاصلح قانون فطرت ہے۔ اور اس قوم کا ہر عمل، عمل صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پائندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے فطرت کے اسی اُصول کو، اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ کو بھانپ لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہو گئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ وہ اپنے نظامِ زندگی کو قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع نہ رکھ سکے۔ اس لیے ان کا نظام "انسانیت" کے لیے ممدِ حیات ہونے کے بجائے وجہِ ہلاکت بن گیا۔ لیکن بایں ہمہ انھیں وہ قوتیں تو حاصل ہو گئیں جن کی وجہ سے آج تمام دُنیا کے مسلمان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ناپائیدار ہی سہی تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمان کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ

قبضے سے اُمّت بے چاری کے دیں بھی گیا دُنیا بھی گئی

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح ہو جائیں تو پھر اس جنتِ ارضی کا پُوچھنا ہی کیا۔ فی عیشۃ راضیہ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گذر ہی نہ ہو جس میں یورپ آج گزر رہا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ

صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اس زمین پر خُدا کی حکومت کا قیام ہے، استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مُسلم وغیر مُسلم، سب حکومتیں گرفتار ہیں۔

یاد رکھئے! جس ایمان وعمل صالح کا جیتا جاگتا، زندہ و پائندہ نتیجہ، اُس دُنیا میں "خُدا کی بادشاہت" کا قیام نہیں یعنی جماعت مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رائی نہیں، وُہ ایمان قرآنی ایمان نہیں، وُہ اعمال، اسلامی اعمال نہیں، انھیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے، نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لیے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے، باقی سب فریب نظر ہے۔

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اِسلام میں
قانون سازی
کا اصُول

اس کتاب میں پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مُصنّفین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے
یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پُورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجئے۔

قیمت فی جلد:- دو روپے آٹھ آنے

میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۷۰ بی - شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

یومِ انقلاب

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو عسکری انقلاب کی تیسری سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن کی یاد منانے کے لئے ہم اپنے لئے اس سے بہتر طریق اور کوئی نہیں سمجھتے کہ اس تین سال کے عرصہ میں، قائدِ انقلاب، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں۔ صدر مملکت پاکستان، نے وقتاً فوقتاً جو اہم تقاریر کی ہیں، اور جو بیانات دیئے ہیں، اور جن کا تعلق اسلام اور پاکستان کی آئیڈیالوجی سے ہے، ان کے اقتباسات یکجا قارئین کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں۔

دسمبر ۱۹۵۸ء۔ لاہور صدر محترم نے، ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو، باشندگانِ لاہور کی طرف سے پیش کردہ ایڈریس کے جواب میں (گلستانِ فاطمہ میں) فرمایا۔

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بےایمانی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغدار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیلِ پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کر دیا جائے کہ انہیں انکی کھوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔

مارچ ۱۹۵۹ء۔ راولپنڈی انہوں نے مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بہ حیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے متجددپسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور قدامت پرستی کی دلیل ہے)

یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجب صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے مثلاً خدا ترسی - بنی نوع انسان سے محبت - ہمسایہ سے مؤدت - یتامیٰ کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد - یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔

جولائی ۱۹۵۹ء - مری

انہوں نے، جولائی ۱۹۵۹ء میں مری میں، کمشنروں کی کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامک آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین عصر حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روح اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا، نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ، ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

ٹنڈو الہ یار

انہوں نے (مئی ۱۹۵۹ء میں) ٹنڈو الہ یار کے مقام پر، علماء کے اجتماع سے خطاب فرمایا تھا جو اپنی جامعیت اور اہمیت کے اعتبار سے، ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جد و جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

جب یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے

کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں۔ اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے۔ تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت میں چلتی ہی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت وصامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کے متعلق انھوں نے فرمایا۔

مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا ان پر "دنیا دار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام۔ ہر نئی ایجاد۔ ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہنما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

اپنے اس دعوے کی شہادت میں، صدرِ مملکت نے کہا۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آجکل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔

اس کے بعد صدر مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند، زندہ، دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا؟

(۲) یا ہم اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا؟ اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے؟

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے؟

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسا شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار

ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقین محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔

اس کے بعد صدر محترم نے فرمایا۔

عالم اسلام کے تشتت و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہرحال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرف نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافی نکات کو ابھارنے کے بجائے ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا۔ ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں

ان اندرونی خرابیوں کے بعد صدر مملکت نے اس بیرونی خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا۔

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان کی باہم کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام ہی وہ نظری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

خطرہ کی روک تھام کے سلسلہ میں انہوں نے فرمایا۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی۔ سیاسی۔ معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی

حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

پاک جمہوریت کا دورہ دسمبر ۱۹۵۸ء کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں صدر مملکت نے ملک کے مختلف گوشوں کا برق رفتاری سے دورہ کیا۔ اس دورہ میں مختلف مقامات پر اہم تقاریر ہوئیں اور پیغامات دیئے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے لئے جمہوریت نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کس انداز کی جمہوریت کی ضرورت ہے۔ کیا مغربی انداز کی جمہوریت (جو وہاں کامیابی سے چل رہی ہے) ہمارے لئے موزوں ہوگی؟ میرا خیال ہے کہ ہمارے تجربے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مغربی قالب کی جمہوریت ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہمارے لئے ایسی جمہوریت کی ضرورت ہے جسے ہم سمجھ سکیں اور کامیابی سے چلا سکیں۔

دوسرے مقام پر انہوں نے فرمایا۔

> جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے، حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

گجرات میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ اور وہ آئیڈیالوجی اسلامک ہے۔ اس لئے اس میں شبہ کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہوگا۔ آئین کمیشن ان حضرات پر مشتمل ہوگا جنہیں اسلام کی بھی پوری پوری واقفیت ہو اور جو علوم حاضرہ سے بھی باخبر ہوں۔ اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر کمیشن کی سفارشات اس معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انھیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ بھی انہیں منظور کرلے اور پارلیمان دیکھے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو وہ دو تہائی کی اکثریت سے ان میں تغیر و تبدل کر سکے گی۔

ملتان کی تقریر میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

> حکومت اس تجویز پر غور کر رہی ہے کہ دیہات کی مساجد کو پرائمری اسکولوں کے لئے استعمال کیا جائے

اور ائمہ مساجد کو ان اسکولوں میں ٹیچر مقرر کر دیا جائے۔ اس میں دشواری یہ ہے کہ تمام ائمۂ مساجد پرائمری تک تعلیم دینے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ بنیادی جمہوریتوں کا ایک فریضہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایسے امام مقرر کریں جو بچوں کو ابتدائی تعلیم دے سکیں۔

اس وقت تو اماموں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں اور پھر گھر گھر سے روٹیاں مانگتے پھرتے ہیں۔ ایسے ائمہ سے آپ یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ ملت کے تعمیری کاموں میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ ۱۳ر جولائی ۱۹۶۰ء کو ادارۂ تحقیقات اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ) کراچی کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کونسے ہیں اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کونسی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

آگے چل کر آپ نے کہا۔

سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے بھی کام نہ لیں) لیکن اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔

اور اس کے بعد فرمایا۔

بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقل عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

یوم انقلاب ۱۹۶۰ء ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر انہوں نے ریڈیو پر جو پیغام قوم کے نام نشر فرمایا، اس میں کہا۔

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصر حاضر میں، روح اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ابدی اور ازلی ہے

لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے آگے چل کر فرمایا۔

قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے۔ اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے، جس میں دین بھی شامل ہے، فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دیگی

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)۔

ممالکِ اسلامیہ کا دورہ نومبر ۱۹۶۱ء میں صدر محترم نے ممالکِ اسلامیہ کا دورہ فرمایا، اور حجاز اور مصر کے اہم مقامات پر ایسی پرشکوہ اور حقیقت کش تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت آج تک ان مقامات میں گونجتی ہے انہوں نے ۴ر نومبر کو سعودی عرب کے دارالحکومت، ریاض میں، ملٹری اکاڈمی کا معائنہ کرتے ہوئے وہاں کے افسروں اور سپاہیوں سے کہا۔

یہ اسلام کا پیغام تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں کو اس قدر عظمت اور شوکت عطا کی تھی۔ اگر ہم پھر اسی عظمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے ـــــ اور وہ طریقہ ہے اسلام سے متمسک ہو جانے کا۔ اگر ہم نے ایسا کیا، تو مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ (دنیا کی) امامت پھر ہمارے حصّہ میں آجائے گی۔

۴ر نومبر کو انہوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

آج ساری دنیا، سیاسی اور مادی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر اپنے اپنے گروہوں کی تشکیل کر رہی ہے۔ ان تصورات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ تصورات، انسان کی انتہائی منزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس دُنیا میں اور اُخروی زندگی میں (نوعِ انسان کی) نجات صرف اس آئیڈیالوجی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ ہم مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ ہمارے پاس وہ آئیڈیالوجی، دینِ اسلام کی شکل میں موجود ہے ـــــ مسلم ممالک کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کی درستی کے بعد، اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کریں اور اس میں باہمی رقابتوں کو دخیل نہ ہونے دیں۔

۶ر نومبر کو قاہرہ کی ایک تقریر میں کہا۔

جب تک ہم اسلام کے بنیادی اصولوں سے متمسک رہیں گے، مادی، سیاسی یا مملکتی حدود کا کوئی خیال، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جدا نہیں کر سکے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وحدتِ مقصد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال کر دے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو آج کی دنیا میں، جس میں آئیڈیالوجی کی کشمکش ہو رہی ہے، ان کے نصب العین تک

کا تقاضا ہے۔

اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا۔

جو لوگ ایمان کے رشتے سے باہم گرپیوست ہوں، وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان میں نزاع اور تشتت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جب یہ ایمان، اسلام کا عطا کردہ ایمان ہو، تو ان میں باہمی افتراق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ اسلام، اختلافات کے مقابلہ میں، اخوت، اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں نرم روی اور سہار، غلط فہمیوں کے مقابلہ میں باہمی افہام و تفہیم اور غصہ کے مقابلہ میں عفو و درگذری کی روح ہے۔

۹ رنومبر کو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں ایک معرکہ آرا تقریر کی جس کے دوران میں کہا۔

مسلمان کہیں بھی ہو، وہ اپنے اللہ سے اور خود اپنی ذات سے ایک عہدِ وفا استوار کرتا ہے۔ یہ عہدِ وفا دنیا کی ہر دوسری وفاشعاری کے عہد سے بلند ہے۔ یہ عہدِ وفا ہے ایمان کا۔ یہی وہ عہدِ وفا ہے جس کی وجہ سے، دنیا کے تمام مسلمان، حکومتوں کے سیاسی اختلافات اور خارجی نزاعات کے علی الرغم، رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آتے ہیں اور خیرسگالی اور خیراندیشی کی غیر مرئی گرہیں انہیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ باہمی مودت اور محبت کا یہ وسیع و عمیق چشمہ دن بدن وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا جائے اور خدا انہیں اس سے محفوظ رکھے کہ وہ اسے ہنگامی فائدوں یا عارضی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

باہمی محبت اور اخوت کا نتیجہ یہ ہے کہ الجیریا کے مسلمانوں پر مظالم ہوں، یا فلسطینی پناہ گزینوں پر۔ کشمیری مسلمانوں کے جانکاہ مصائب ہوں یا اسرائیلی حکومت کی آئے دن کی دھمکیاں، یہ علاقائی اثرات نہیں رکھتیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں یکساں جذباتِ ہمدردی کو بیدار کر دیتی ہیں۔

انہوں نے اپنی جدہ کی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجبِ تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان (کے فائدے) کے لئے دیا گیا تھا، انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں

بنا دیا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے، اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن (یہ بھی ضروری ہے کہ) یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان، اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FATIH) سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نفاذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں، شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر کہا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں، اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں، دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

اور قاہرہ یونیورسٹی کی تقریر میں فرمایا تھا۔

جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل و حقیقت کی جگہ مظہریت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی۔ اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو، تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اور وہ دین، جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک متحرک، متحرک اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔

نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مُڑ مُڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسے آگے بڑھاتے جائیں۔

۱۰ نومبر کو صدر پاکستان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) نیشنل یونین ریلی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ ہوتی کیا ہے؟ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالئے بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دُنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہوگئی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلاخوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہ نماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملّی روایات کے حفظ و بقاء کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور (۱۱) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اپنی کمزوریوں

اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، تو ہم پھر دوسروں کے غلام بن جائیں گے۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔

دین کی غرض و غایت اور اسلام کی آئیڈیالوجی کو اس طرح واشگاف کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامک آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجۂ جواز ہی یہی ہے، اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم حتی الامکان عصر حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔

عیدالاضحیٰ کی تقریر

اس سال عیدالاضحیٰ کی تقریب پر، صدر محترم نے، ملک کے نام ایک تقریر نشر فرمائی جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا نقل کر دیا جائے۔ وھو ھذا۔

عزیز ہم وطنو! عید مبارک! عیدالاضحیٰ کا مبارک دن، اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمی روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔ یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا، بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں، لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہیئے۔

ماضی کی چار دیواری

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے، اور انسان کا ذہن بہت ہی

ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو اپنی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہموطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے ہی سے ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

ابدی اصول کلام پاک کے اندر ہیں

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اگر چہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے، لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔

اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر ان کی پرستش کی جائے۔ اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص ہاتھ لگاتا تھا، صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔ چنانچہ آج اس بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ پنکھے چلتے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود، بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول قائم ہیں اور ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

سُنّت۔ حدیث اور فقہ

یہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں، اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سُنّت۔ حدیث اور فقہ، سب اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں، جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانہ میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا؟

روشنی کے مینار رہنمائی کے لئے ہوتے ہیں۔ جمود کے لئے نہیں۔ جمود تو تاریکی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ترقی کا راز تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان پر مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہیں اور پھر ماضی کو مشعلِ راہ بنا کر حال اور مستقبل کی دنیا میں عمل کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسلام تو اپنی جگہ سلامت رہے گا۔ لیکن مسلمان دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ کیونکہ اسلام فقط اپنی ذات کیلئے زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی مسلمانوں کو سربلندی کے ساتھ زندہ رکھنے کے لئے آیا ہے۔

اسلام اور پاکستان

ایک اور ضروری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلام کی جتنی ضرورت پاکستان کو ہے۔ اتنی کسی اور کو نہیں۔ اگر خدانخواستہ دُنیا کے دوسرے ممالک اسلام سے دور بھی ہو جائیں تو آخرت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کم از کم اس دنیا میں ان کی قومیت اپنی جگہ قائم اور سلامت رہے گی۔ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور صرف اسی نام پر یہ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اسلام کے علاوہ ہماری قومیت اور سالمیت کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ یہ بنیاد صرف تصور اور نظریہ نہیں بلکہ عمل پر قائم رہ سکتی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے ایمان اور عمل میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی اسی طرح پاکستان بھی مضبوط ہوتا جائے گا۔ ورنہ اگر ہمارے ایمان اور عمل میں تضاد پیدا ہوتا گیا تو یہ شدید خطرہ ہے کہ پاکستان کا وجود بھی کھوکھلا ہو کر منتشر ہونے لگے گا۔ چنانچہ اگر روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے نہیں تو کم از کم اپنی قومی بقا اور سلامتی کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور اس پر سچائی اور اخلاص سے عمل کریں۔ اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو زیادہ

سے زیادہ پڑھیں۔ اس کی حکمت اور احکام پر غور کریں اور پھر اپنے نئے اور پرانے علم کی روشنی میں وہ راستے تلاش کریں جن پر چل کر ہم آجکل کی دنیا میں ہر لحاظ سے اچھے مسلمان اور اچھے انسان بن کر رہ سکیں۔ میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اس مقصد کو پورا کرنے

قرآن سمجھ کر پڑھیں

کے لئے آپ اپنے علم اور عمل کی ساری صلاحیتوں کو پورے طور پر کام میں لائیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی سرکاری غیر سرکاری مجلس یا تقریب میں قرآن شریف کی تلاوت کی جائے وہاں ان آیات کا آسان اور عام فہم ترجمہ بھی ضرور سنایا جائے اور پھر اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ ان آیات میں جو جو احکام یا اصول بیان ہوئے ہیں، آجکل کی زندگی میں ان پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف ذاتی یا انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک منظم تحریک کے طور پر جلد از جلد شروع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعمیل کر سکیں، جس میں بار بار یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیات پر غور و فکر کرو تاکہ ان کی حکمت اور بصیرت کا نور حاصل کر سکو۔ اس سلسلہ میں عوام کے نمائندہ ادارے، مثلاً بنیادی جمہوریتوں کی مختلف کونسلیں کارپوریشنیں۔ میونسپل کمیٹیاں۔ وغیرہ بہت بڑا کام کر سکتی ہیں میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ باضابطہ پروگرام بنا کر وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کریں۔ تاکہ سکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کے علاوہ۔ ہر گاؤں۔ ہر گلی، ہر محلہ میں قرآن پاک کے درس جاری ہو جائیں، جن میں قرآن پاک کی تعلیم، اور اس تعلیم پر عمل کے طریقوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ جہالت اور گمراہی کے خلاف یہ ایک ایسا جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو ایک جاں باز سپاہی کی طرح شامل ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر اس طبقہ کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیئے جو تعلیم یافتہ اور مہذب ہے۔ اور جسے ہم باشعور طبقہ کے نام سے پکارتے ہیں، تاکہ مذہب کو ایک دقیانوسی چیز سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کا فیشن ختم ہو جائے۔ اور یہ طبقہ پاکستان کی آزادی اور نصب العین کی حفاظت اور رہنمائی کر سکے۔ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا اور خدا کے بتائے ہوئے صراط مستقیم کی صحیح طور پر تلاش نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارا روحانی۔ اخلاقی۔ مادی اور قومی وجود انتہائی خطرہ میں پڑ جائے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میری اپیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں ـــــ خدا آپ کا مددگار ہو۔

مفتی صاحب کے خط کے جواب میں

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، نے صدر محترم کو عائلی قوانین کے سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا۔ جس کے جواب کے آخر میں صدر مملکت نے (جون ۱۹۶۱ء میں) لکھا تھا۔

اصولوں سے انحراف تو قطعی ناممکن ہے۔ لیکن ان پر عمل کے طریق کار کو تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ وضع کرنا صرف حکومت کا ہی نہیں بلکہ خود علمائے کرام کا بھی فرض ہے۔ اس بات کو میں "فرض" اس لئے کہتا ہوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم حال اور مستقبل کے دور میں زندگی کو لادینی کے غار سے بچا سکتے ہیں

نئے طریق کار

ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیثیت سے، میرا خیال ہے کہ سُنّت، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہمیں عمل کے ایسے طریقہائے کار وضع کرنے پڑیں گے جو آجکل کی دنیا میں قابلِ عمل، اور موجودہ اذہان کے لئے قابل قبول ہوں۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم خود زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کرنے کے مجرم ہوں گے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مروجہ روش سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بات ان طبقوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یا جن کے لئے وہ روش کسی قسم کے ذاتی یا اجتماعی منفعت یا وقار کی باعث تھی۔ لیکن سچے جذبۂ خدمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایسی ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹوں کو ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے۔

سینٹ پیٹرک اسکول

۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء کو، کراچی کے سینٹ پیٹرک اسکول کی صد سالہ بری کی تقریب پر صدر محترم نے ایک تقریر فرمائی تھی۔ اس سے پہلے، اسکول کے پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں روایات کی شدت سے پابندی کرنی چاہیئے۔ صدر محترم نے اس نکتہ کے متعلق فرمایا۔

واجب الاحترام پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں ایک ایسا اصولی نکتہ بیان فرمایا ہے جس کے متعلق میں کچھ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے

ہمیں روایات (Traditions) کا بہت زیادہ احترام کرنا چاہیئے، اور مستقبل کی خاطر، اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج کل یہ رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ لوگ زمانے کے تقاضوں کے ماتحت، اپنے ماضی کا مذاق اڑاتے ہیں، اور اس بات کا بھی انہیں علم نہیں ہوتا کہ وہ مستقبل میں اخلاقی اور روحانی بنیادوں کے معنی کیا کریں۔

یہ بڑا بنیادی نقطہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک اہم بنیادی مسئلہ ہے جو عام مذاہب کو بالعموم، اور عیسائیت

اور اسلام کو بالخصوص درپیش ہے۔ پاکستان میں ہمیں خصوصیت سے اس اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس سے پیشتر، جبکہ زندگی یعنی معاشرہ جامد تھا، متحرک نہیں تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ آپ آنکھیں بند کئے، قدیم روایات کے مطابق چلتے جائیں۔ اور زندگی کو انہی کے قالب میں ڈھالے رکھیں۔ ان حالات میں، یہ طرزِ عمل صحیح قرار پا سکتا تھا۔ لیکن اب، جبکہ لوگوں میں تعلیم عام ہو رہی ہے ـــــ اور پاکستان میں آئندہ پندرہ بیس سال میں تعلیم بالکل عام ہو جائے گی ـــــ حالات اس سے بالکل مختلف ہو چکے ہیں

تعلیم کے معنی کیا ہیں؟ اس سے انسانوں میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ میرے نزدیک، تعلیم، انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے لئے آپ سوچے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان خود سوچنے لگ جائے، تو اس وقت محض کتب مقدسہ اور روایات کے حوالوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اس وقت ضروری ہو گا کہ آپ مذہب اور فلسفۂ مذہب کے اصولوں کو پیش کرنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کر دیں، اور انہیں اس زبان میں پیش کریں جو اس زمانے کے سوچنے والے انسانوں کی سمجھ میں آ سکے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ بیشک آپ قدیمی روایات کا احترام کریں اور یہ سمجھ لیں کہ کسی خاص زمانے کے لئے وہ کس قدر مفید تھیں، لیکن آپ اپنے آپ کو ان روایات کے ساتھ باندھ نہ لیں۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو روایات کے ساتھ باندھے رکھا، تو زمانہ آپ کا انتظار نہیں کرے گا۔ وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔ لہٰذا، عیسائیت اور اسلام جیسے مذاہب کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ انہیں زمانے کا ساتھ دینے کے لئے ـــــ یعنی ان لوگوں کے نفسیاتی۔ ذہنی اور روحانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو آجکل دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں ـــ کیا کرنا چاہیئے؟

میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ تمام اچھے مذاہب کی طرح، ان کے ہاں مذہب کے کچھ اصول ہیں اور باقی وہ طریقے ہیں جن کے مطابق ان اصولوں کو (زمانے کے تقاضوں کے مطابق) عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ زندگی کے بنیادی اصول آج بھی وہی ہیں جو آج سے سینکڑوں، ہزاروں سال پہلے تھے لیکن ان پر عمل کرنے کے طریقے بدل چکے ہیں۔ ہمیں ان بنیادی اصول کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ آپ ان غیر متبدل اصولوں کو الگ کر لیجئے۔ انہیں ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیجئے۔ اور پھر معاشرہ کو اس کی آزادی دیجئے کہ وہ ان اصولوں کو، دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق، عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ان مذاہب نے ایسا نہ کیا تو یہ ڈوب جائیں گے اور کمیونزم

ان پر پوری طرح مسلط ہو جائے گی۔

ہم نے گذشتہ چالیس سال میں دیکھا ہے کہ کمیونزم، بدھ مت اور عیسائیت کے سامنے آئی لیکن یہ مذاہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اب ہماری باری آ رہی ہے۔ اگر ہم بھی بیدار نہ ہوئے تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو ان مذاہب کا ہوا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ راز حیات اسی اصول میں مضمر ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے)۔ جو لوگ (کمیونزم کے سیلاب میں بہ جانا نہیں چاہتے بلکہ) اپنے روحانی اور اخلاقی ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، انہیں ایسا کرنا ہوگا۔ اور جو لوگ مذہبی امور میں ماہر ہیں، انہیں، اس باب میں، دوسرے لوگوں کی راہ نمائی کرنی ہوگی۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ زمانہ کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ مادہ پرستی کا سیلاب امنڈ آئے گا اور آپ لوگوں کو کبھی اس پر مجبور نہیں کر سکیں گے کہ وہ آپ کی نہج پر سوچیں۔

محترم پادری صاحب! میں نے جو کچھ کہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نہ ہو۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی لے آؤں، اور اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر دوں۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لئے بھی پیش آئی کہ آجکل پاکستان میں ہمارے سامنے یہی مسئلہ درپیش ہے، اس لئے یہ ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں علوم دینیات کا ماہر نہیں ہوں۔ لیکن عمومی فکر کی رُو سے جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی آتا ہے کہ ہمیں غیر متبدل اصولوں کو (بدلنے والے طریقوں سے) الگ کر لینا چاہیئے۔ لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ غیر متبدل اصول کیا ہے۔ اس کے بعد انہیں اس کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کو، اپنے زمانے کے مطابق، عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔

اگر آپ نے ایسا کر لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کا غیر متبدل اور محیر العقول مذہب کامیاب و کامران نہ ہو!

۲۵ ستمبر ۱۹۶۱ء کو، کراچی میں، بنیادی جمہوری اداروں کی خواتین کی طرف سے، ایک سپاسنامہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے صدر محترم نے فرمایا۔

قرآن کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیاتِ زمانہ

کے مطابق ان پر عمل کرے..... (یاد رکھئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے۔

(بحوالہ نوائے وقت - ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

یوم انقلاب ۱۹۶۱ء

انہوں نے، ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام، ملت کے نام، اپنے پیغام میں فرمایا۔

جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، ہمارے آئین کا بنیادی جوہر اسلام کی روح ہوگا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسی کی خاطر اسے حاصل کیا۔ ہماری بقا اور فلاح کا راز، اسی اسلامی روح کے ساتھ دیانتداری سے تمسک میں ہے..... ہمارے ملکی نظم و ضبط، بلکہ ہماری پوری زندگی میں اسلام ہی ہمارا پیش نہاد ہے اور میری کوشش یہ ہے کہ میں کم از کم ایک ایسی مشینری کی بنیاد رکھ دوں جو ہمارے ایمان کی روح کو کشید کر کے، اسے ہماری عملی زندگی میں پھونک دے جس سے ہمیں روشنی اور ہدایت اور فلاح و سعادت نصیب ہو۔

اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے، کہ دین کے بنیادی اصولوں کے علاوہ، انسانی معاملات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ناقابل تغیر و تبدل ہو۔

(پاکستان ٹائمز ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

معاشی مسئلہ آج نوع انسانی کی تاریخ کا عظیم ترین مسئلہ قرار پا چکا ہے ۔۔۔ عصر حاضر کے مفکرین نے اسے حل کرنے کے لئے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ یہ نظریات انسانی ذہن کی تازہ بتازہ تجربات کی پیداوار ہیں۔ اس کے مقابلہ میں محترم پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیت

اس مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوع انسانی کے لئے بارگاہ رب العلمین سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ "نظام ربوبیت" اس موضوع پر اپنی نوعیت کی بے مثال تصنیف ہے۔

رعایتی قیمت - چار روپے۔ **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۲۷ - بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور**

یوم قائدِ اعظم کی یاد میں

کاروانِ ملّت کے تین عظیم سالار

سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو

(صفدر سلیمی)

اٹھارویں صدی (عیسوی) کا آغاز ہو چکا تھا۔ سلطنتِ مُغلیہ کا جاہ و جلال آخری ہچکیاں لے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس برصغیر کے مُسلمانوں کی داستانِ زوال مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے دوچار ہو رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قومی زوال اور شکست کی یہ تاریک رات عہدِ رفتہ کی سمت میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطانی اور ملوکیت "ظل اللہ" کا لبادہ اُوڑھ کر اور اسلام کی محافظ بن کر آئی تھی۔ دینِ خُدا کو دینِ استبداد میں اسی نے تبدیل کیا تھا۔ اُس کی عطا فرمودہ آزادی فکر و نظر پر خوف و ہراس کی تعزیریں اسی نے قائم کی تھیں۔ انسانی حریت و مساوات کی جنتِ ارضی کو اسی کے ہاتھوں زیر و زبر اور پامال ہوئی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی متاعِ حیات راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور جب مغلوں کے زوال کے بعد یہاں یونین جیک کی پرچم کشائی کا دور آیا تو مسلمان کی رگِ حیات اس خونِ گرم سے بے نصیب ہو چکی تھی جس کی حرارت نے اسے مُدّت تک ذوقِ سفر سے سرشار اور سرگرمِ تگ و تاز رکھا تھا۔

ایک صدی پہلے ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند، شدّتِ جذبات کی آخری بھڑک ثابت ہوئی۔ ایسا نظر آتا

ہے کہ کارگہِ سیاست کے شکست خوردہ مسلمان نے مرغِ بسمل کی آخری تڑپ سے کام لیا اور اپنی ناتوانیوں کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نئے اور طاقتور حکمرانوں کو دعوتِ پیکار دیتا میدان میں نکل آیا۔ لیکن یہ جرأتِ رندانہ اِسے بہت مہنگی پڑی۔ فتحمند شاطرانِ فرنگ کی عقابی نگاہیں اس حقیقت کو بھانپ چکی تھیں کہ جب تک یہاں کے مسلمانوں کو ان کے قومی تشخص اور احساس خودی سے کلیۃً محروم نہ کر دیا جائے ان کا شاندار ماضی راکھ کے ڈھیروں سے غیرت کے شعلے بھڑکاتا رہے گا۔ وہ اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لیے — جذباتی طور پر ہی سہی حرکت میں آتے رہیں گے اور غیر ملکی حکمرانوں کو نت نئے خطروں سے دوچار رکھیں گے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے، انہوں نے ہندوؤں کو اپنی آغوشِ لطف و مرحمت میں لے لیا اور مسلمانوں کے ملی وجود کی رہی سہی حرکت کو ختم کرنے کے لیے جوشِ انتقام کا ہر ممکن حربہ بروئے کار لانا شروع کر دیا۔ آقائے فرنگ کی سرپرستی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر برادرانِ وطن دیوانہ وار دفتری نظام کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ مسلمان جس نے ایک ہزار برس تک اس برصغیر پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا تھا اب نئے حکمرانوں کی آتشِ انتقام میں اپنی متاعِ حیات کو بھسم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ محکومی و مظلومی، غربت و افلاس بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے ہر چہار اطراف سے اسے اپنے حصار میں لے چکے تھے۔ اس کی زندگی کے قبرستانوں میں چاروں طرف مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دم توڑتی قوم اس عالمِ سکرات میں ایک بار پھر کارگہِ حیات میں صف آرا ہو سکے گی۔ اور مؤرخ کا قلم اس کی نشاۃِ ثانیہ کی داستان تاریخ کے صفحات پر رقم کر سکے گا۔

۱۸۵۷ء میں ہم اپنی قومی زندگی کے نازک ترین مقام پر کھڑے تھے۔ کوئی معجزہ ہی ہمیں اس اندوہناک موت کی زد سے بچا سکتا تھا جو تیزی سے ہمارے دروازوں کی طرف بڑھے چلی آ رہی تھی۔ لیکن قوموں کی موت و حیات کے قوانین کی معجز نمائیاں بھی کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ یہ معجزہ بالآخر نمودار ہوا اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہم کس طرح زوال اور شکست کے افق میں ڈوب کر پھر آزادی و استقلال کے مطلع پر صورتِ خورشید اُبھر آئے۔ کسی قوم کا زوال اور شکست کی ہچکیوں سے نجات پا کر از سرِ نو زندگی سے ہمکنار ہونا معمولی بات نہیں بڑی ہی خوش نصیب ہے وہ قوم جسے یہ شرف حاصل ہو جائے اور مستحقِ تبریک ہیں وہ داعیانِ انقلاب جن کی دعوتِ انقلاب ایسے معجزوں کی امین ثابت ہو۔

اشاعت زیرِ نظر میں ہمارا موضوع اپنی اسی نشاۃِ ثانیہ کی گرانمایہ یاد کو تازہ کرتے ہوئے ان جلیل القدر زعماء کے مقام و پیام کو قارئین کے سامنے لانا ہے جو ہمارے سفینۂ حیات کو بھنور سے بچا کر ساحلِ مراد تک لے

گئے اور ان کے عزم و استقلال اور دعوتِ انقلاب نے ہمیں دُنیا کی آزاد قوموں کے دوش بدوش گامزن ہونے کے قابل بنا دیا۔ تاریخ بتائے گی کہ زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم و جلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب ہوتی تو آج ہمارے سروں پر آزادی کا ہلالی پرچم سایہ فگن نہ ہوتا بلکہ اغیار کی غلامی اور محکومی میں ہماری بے بسی و بے چارگی صفحۂ تاریخ پر ذلت اور شکست کا بدنما داغ بن کر ثبت ہو جاتی۔

زعیم اوّل ـــــ سرسیّد احمد خانؒ

ہماری نشاۃ ثانیہ کی اس داستان میں سرسید علیہ الرحمۃ کی نادر الوجود شخصیت نقیب اوّل کی حیثیت سے اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ وہی سرسید جو کنکوے اُڑاتا اور صدر امینی کے دفتر میں معمولی سررشتہ دار کی حیثیت سے کام کرتا مرکزی لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت تک پہنچا۔ اور پھر اس کے بعد وقت کے تقاضوں پر لبیک کہتا ہوا، سارے اعزازات کو بالائے طاق رکھ کر، اس جذبۂ جنون اور عزم و استقلال کے ساتھ میدانِ عمل میں آیا کہ اس کے جوشِ عمل نے اس برصغیر کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اور ملتِ اسلامیہ اپنے عزّ و شرف کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ پانے کے قابل ہو گئی۔ شہرہ آفاق ترک خاتون خالدہ ادیب خانم نے اس زعیمِ ملت کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کس قدر درست کہا تھا کہ

> سرسیدؒ کو کسی پہلو سے بھی دیکھا جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا بھاری پتھر تھا جو اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا اور اس نے جو لہریں پیدا کیں وہ آج تک برابر حرکت میں ہیں۔ خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جسے سرسیدؒ پسند کرتے تھے۔

(مقدمہ حیات جاوید) (بحوالہ علی گڑھ میگزین)

عقل و فکر کی دعوت

سرسیدؒ قومی زوال اور شکست کے جس ماحول میں مردانہ وار آگے بڑھے آج اس کا صحیح صحیح جائزہ لینا اور اندازہ لگانا آسان نہیں۔ جذبات کے دھاروں پر بہتے ہوئے سرسیدؒ کو اندھا دھند ہدفِ تنقید بنایا جا سکتا ہے اور بعض گرم جوش حلقے آج بھی ایسا کھیل کھیلنے پر نازاں ہیں لیکن ہے کوئی جو علیٰ رؤس الاشہاد اس کا جواب دینے کی جرأت کرے کہ اگر سرسیدؒ کا عزم و فراست اور خالص عملی اندازِ فکر اس نازک اور کڑے وقت پر اپنی قوم کو پیشِ نظر حقائق پر سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت نہ دیتا تو آج ہمارا حشر کیا

ہو چکا ہوتا ؟

مشہور برطانوی مدبر ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی اشتعال انگیز کتاب "انڈین مسلمانز" میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اس نے انگریز حکمرانوں کے دلوں میں غیض و غضب کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی طبعی دشمنی ثابت کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر اپنے جوش بیان میں تحریر کرتا تھا کہ

مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور کسی طرح بھی گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں بن سکتی۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں علمائے اسلام سے ایک استفتاء کیا تھا اور حالات اس قدر نازک تھے کہ کسی سے اس کا دو ٹوک جواب دینے کی جرأت نہ ہو سکی تھی ڈاکٹر ہنٹر کا سوال یہ تھا کہ

اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو کیا اس ملک مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی امان تک کرنی اور غنیم کی امداد کرنی جائز ہو گی۔

حق گوئی و بیباکی

سوچئے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند کے بعد جب کہ دلوں پر خوف و ہراس کے پردے بٹھا دیئے گئے تھے اور زبانوں پر سکوت کی مہریں لگ چکی تھیں اس نازک سوال کا مسکت اور دو ٹوک جواب کس طرح اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس سوال کا جواب دیا گیا۔ یہ صرف سر سید علیہ رحمۃ تھے جنھوں نے جواباً ہر خوف سے بے نیاز ہو کر "آئین جوان مرداں" کی لاج رکھی اور گرج کر کہا کہ

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کو کسی بڑے ہنگامے میں قوم کا حال ہو گا لیکن میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کچھ کریں گے جو ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرائیگی۔

اور حکمرانوں کے دلوں نے شہادت دی کہ سچے مسلمانوں کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کو جس قیامت سے گزرنا پڑا اس نے سر سید کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ مولانا حالی نے حیات جاوید میں ان کے ایک دوست کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے سر سید کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی گرنے نے"۔ حالات گواہ ہیں کہ ملت کا جو حشر ہوا اس نے ہمیشہ کے لیے سر سید کی زندگی کا سکون اور اطمینان چھین لیا اور اس کے بعد قوم کو موت سے بچانے کے لیے وہ ساری زندگی آتش زیر پا رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۲۸۔ دسمبر ۱۸۸۹ء) میں انہوں نے خود اپنی تقریر

میں کہا تھا۔

میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سرِ نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بوڑھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔

جُداگانہ منزل

مسلمانوں نے جس مقصدِ عزیز کے لیے غیر ملکی سامراج کے خلاف سرِدھڑ کی بازی لگائی تھی اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا تھا اس کا تعلق محض ان کی اپنی آزادی سے نہیں تھا بلکہ وہ پُورے برصغیر اور برادرانِ وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے لیکن جب اس بلوہ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو حکومت کے شدید تیز انتقام کا شکار بننا پڑا تو برادرانِ وطن نے کلیتہً آنکھیں پھیر لیں۔ وہ نہ صرف دفتری نظام میں حکومت کے دستِ و بازو بن گئے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے خلاف محاذ کھڑا کر لیا۔ سر سیدؒ نے کم و بیش دس برس تک انھیں محبت اور رواداری سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ اس کا اُلٹا اثر ہو رہا ہے اور (اور تو اور) اُردو زبان کو مٹانے کے لیے محض اس لیے پنجاب سے بنگال تک فتنہ برپا کر دیا گیا ہے۔ کہ یہ زبان مسلمانوں کے دورِ اقبال کی یادگار ہے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کو اپنی جُداگانہ منزلِ مقصود کے لیے سامانِ سفر باندھنا چاہیئے۔ ان کی آواز پُورے ملک میں سُنی گئی جب کہ اُنہوں نے کہا کہ۔

مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے آگے جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب اُبھرے گا۔ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔　　(حیاتِ جاوید)

سر سیدؒ نے یہ الفاظ ۱۸۶۷ء میں کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کہے تھے۔ اس پیش گوئی کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے کہ اسّی برس کے اندر اندر یہ الفاظ کیونکر قاضیٔ تقدیر کا اٹل فیصلہ بن کر محسوس و مشہود اور جیتی جاگتی تاریخی حقیقتوں میں ڈھل گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس داستان کا آخری باب تکمیل پا گیا

قومی تعلیمات کا تعمیری مرحلہ

۱۸۶۷ء میں سر سیدؒ نے اپنے جُداگانہ قومی مستقبل کی جزئیات متعین کر لی تھیں ان کے ذہن میں اس تعمیرِ ملّی کے خاکے ترتیب پا رہے تھے۔ افرادِ ملت کی تعلیم و تربیت اور ان کے فکر و شعور کا نشوو ارتقاء ان کے تعمیری منصوبوں کی اساس قرار پا چکا تھا۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے حالات کی انتہائی نامساعدت میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر علی گڑھ کے اس فقید المثال دارالعلوم کی تعمیر میں منہمک ہو گئے جہاں سے ایک افسردہ و نیم مُردہ قوم کے نونہال ستارے بن کر ابھرے اور اس کا افقِ تقدیر ایک

بار پھر ان ستاروں کی تابانیوں اور ضو فشانیوں سے جگمگا اٹھا۔

قومی تعلیمات کے اس مرکزِ عظیم کی تعمیر و ترقی کے جنون میں سرسیدؒ نے کس طرح اپنی جان لڑا دی، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی مثال ہندوستان تاریخ میں نہ اس سے قبل پیدا ہو سکی اور نہ شاید اس کے بعد ہو سکے۔ اس دور کے تعلیمی کمیشن کے چیئرمین مسٹر والڈ نے جب پہلی بار اس دارالعلوم میں قدم رکھا تو اپنی ڈائری میں اس نے تحریر کیا کہ

> جس وقت میں نے ان کمروں کی قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی عمدہ ترین عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو۔ جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر سکتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے
>
> (حیاتِ جاوید)

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے سرسیدؒ کی وفات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کے اسی شاہکار کی طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ

> جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں وہ اس قدر مفلس تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو۔ لیکن وہ آپ کے لیے ایک گراں مایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشانِ منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔ (حیاتِ جاوید)

وحدتِ خیال کا مرکز

علی گڑھ کے اس عظیم الشان دارالعلوم کا مقصد محض نئی نسل کی تربیت نہ تھا بلکہ اس سے کہیں آگے تھا۔ ہمارے نامور ادیب صلاح الدین احمدؒ کے الفاظ میں سرسیدؒ کی دوربین نگاہوں کے سامنے اس سے کہیں اہم منزل کچھ اور تھی، اور وہ یہ کہ

> وہ علی گڑھ کو مسلم لیڈرشپ کے لیے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیطِ کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پراگراموں کی بجائے وہ پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے زمانے کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انھوں نے ملتِ اسلامیہ کی فلاحِ عام کے لیے تیار کیا تھا۔ . . . چنانچہ علی گڑھ کو انھوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور

بے داری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وُہ برعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچکر اثر آفرین ثابت ہوئیں

(مقالہ سرسید احمد خان پر ایک نظر)

سرسیدؒ کا عظیم مشن ان الفاظ سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو انھوں نے طلبائے دارالعلوم سے ایک خطاب کے دوران میں کہے تھے۔ انھوں نے اپنے شاہین بچّوں پر واضح کیا تھا کہ

> یاد رکھو: سب سے سچّا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمّد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر تم اگر آسمان کے ستارے بھی ہوگئے تو کیا! مجھے اُمید ہے کہ تم، علم اور اسلام، دونوں باتوں کے نمونے ثابت ہوگے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزّت نصیب ہوگی۔ (حیاتِ جاوید)

اسلامی قومیت کا وجود کیونکر وطن، رنگ اور نسل کی بجائے آئیڈیالوجی اور صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پر عمل میں آتا ہے۔ اور عقیدہ ایمان کی نظریاتی اساس پر مسلمان کیونکر ایک الگ قوم و ملّت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں شاید یہ اس دور کی پہلی آواز تھی جسے قومی تعلیمات کے اہم ترین جزو کی حیثیت سے نئی نسل کے ذہن نشین کیا گیا۔ یہ تصور تھا جو نوجوانانِ ملّت کے قلوب میں بویا گیا اور نظریہ پاکستان کی کونپلیں بن کر آہستہ آہستہ برگ و بار لایا۔

خلوص و ایثار کا مظہر

یہ تھا جُداگانہ اسلامی قومیت کا وہ بیج جو علی گڑھ میں بویا گیا۔ اس کی تربیت اور نشوونما کے ممکن مواقع بہم پہنچائے گئے۔ اسی کے لیے وُہ ذہنی جمود توڑا گیا جس کے مذہبی اجارہ داروں نے اس زعیم کے خلاف کُفر بازی کا طوفان برپا کر دیا۔ لیکن یہ طوفان باوجود سرسیدؒ کو اس کے مقصدِ عزیز سے جُدا نہ کر سکا۔ مخالفت کے اسی طوفان میں اُسے پنجاب کے مسلمانوں سے (لاہور میں) خطاب کرنے کا موقع ملا یہ ایک تاریخی خطاب تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ زعیم قوم نے اپنے دل کے زخم بے نقاب کر کے زندہ دلانِ پنجاب کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ بڑی دل سوزی سے اس نے کہا تھا۔

> بزرگانِ پنجاب! فرض کیجئے کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مُرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خیر خواہ اور خادم نہیں سمجھیں گے؟ آپ کی دولت سرا بناتے ہیں، جس میں آپ آرام فرماتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بناتے ہیں، جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چاہ مزدُور، چمار قلی، کافر بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نے کبھی اس دولت

خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنا گھر بننے دیجئے۔ (حیات جاوید)

۱۸۷۳ء کا یہ خطاب کس قدر اثر انگیز تھا، مولانا حالی اس کا چشم دید خاکہ "حیات جاوید" میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم طاری تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے بڑھ کر چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ . . . یہی الفاظ جو آج معمولی باتیں معلوم ہوتے ہیں اس موقع پر جب سرسید کی زبان سے نکلے تھے تو ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا تھا۔"

فکری جمود کے خلاف جنگ

سرسیدؒ ہر قیمت پر صدیوں کے قومی جمود کو توڑنے پر تلے ہوئے تھے انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک قوم میں یہ اٹھان نہ پیدا ہو گی کہ وہ مسلک تقلید کی زنجیریں توڑ کر نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق سفر زندگی شروع کر سکے اس وقت تک عظمت رفتہ کی بازآفرینی کا کوئی امکان پیدا نہیں ہو گا۔ چناں چہ جہاں انہوں نے قلوب و اذہان میں نئی روشنی پیدا کرنے کے لیے مرکز تعلیمات پر پوری توجہ مرکوز کی وہاں تحریروں اور تقریروں کے ذریعے قومی فکر و بصیرت اور اجتماعی شعور کو جھنجھوڑنے کی بھی کوشش کی۔ اس راہ میں انھیں مذہبی اجارہ داروں کی مخالفت کی جس شدت سے دوچار ہونا پڑا اس نے ماضی کے سارے ریکارڈ مات کر دیئے۔ ان کے خلاف ہزاروں کی تعداد میں جو فتوے شائع ہوئے ان میں اس گراں مایہ زعیم کو شیطان ابلیس لعین اور دجال تک کہا گیا۔ اس کا قتل واجب قرار دیا گیا۔ لیکن اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

ان فتووں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالیؒ نے کس قدر درست کہا تھا کہ

درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں بلکہ سرسیدؒ کے اعلیٰ درجے کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تحفے انھیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ (حیات جاوید)

کیا تعصب کے یہ شاہکار اس داعیٔ انقلاب کی عظمت کو داغدار کر سکے؟ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایسا ہرگز

نہیں ہوا سرسیدؒ نے اپنے مقام بلند سے ہمیشہ یہ سب کچھ مسکراتے ہوئے سنا اور اس کی روشن پیشانی پر کبھی شکن تک نہ ابھری، اس کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ اس سے دشمنی کے باوجود ہندوان وطن کے دلوں میں ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ لے کاش ان کے ہاں بھی کوئی سرسیدؒ ہو۔ حیات جاوید میں مولانا ذکاء اللہ کی تحریر کے حوالے سے الہ آباد کے جلسہ عام میں ایک فاضل پنڈت کی تقریر کا ذکر کیا گیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ

> ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں، تعلیم میں فائق ہیں۔ تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں لیکن افسوس کہ ہم میں کوئی سرسیدؒ نہیں۔ بلکہ ہم میں سے بیس مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سرسیدؒ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔

حکیم انقلابؒ ـــــ علامہ اقبالؒ

انیسویں صدی کے آخر میں سرسیدؒ ہم سے رخصت ہو گئے اور ایک ایسی قوم پیچھے چھوڑ گئے جس کے نونہالوں کے سینے قومی تعلیمات سے منور ہو رہے تھے۔ اس کے مسلک تعلید اور قدامت پرستی کے سانچے آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے تھے اور ذہنی جمود کی برفانی سلوں نے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ درست تھا لیکن جہاں تک ملت اسلامیہ کی ذہنی نفسیات کا تعلق ہے یہ مقام ہماری حیات اجتماعی میں بڑا ہی نازک مقام تھا۔ قوم روایات کہن کی پرستش گاہوں سے نکل کر آزادی افکار کی کھلی فضا میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے احساسات کی جمود انگریزیوں نے اب صورت سیلاب اختیار کر لی تھی۔ اس کے خوابیدہ افکار نے کش مکش اضطراب سے دو چار ہونا تھا۔ وقت کا اہم ترین تقاضہ یہ تھا کہ افکار و احساسات کی شوخیاں اپنے بند توڑ کر بے باکی اور سرکشی پر نہ اتر آئیں انہیں زندگی کی مستقل اقدار کے ساحلوں میں پابند رکھنا اشد ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ جو قوم آئیڈیالوجی کے اشتراک پر زندگی کی گزرگاہوں کو طے کرنا چاہتی تھی اس کے لیے ان اقدار کا سرچشمہ خدا کی آخری کتاب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سرسیدؒ کی موت کے بعد کم و بیش پچیس برس تک قومی زندگی کا میدان ایسے حکیم انقلاب سے خالی رہا جو تقاضائے وقت کی اس پکار کا جواب دے سکے۔ قوم ایسے دانائے راز کی منتظر رہی جو ان اقدار حیات کو روح اسلام سے کشید کرے اور انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق عصر حاضر کی زبان اور الفاظ میں افراد ملت کے ذہن نشین کر سکے۔ سرسیدؒ کے بعد ربع صدی کا قیمتی عرصہ اسی محرومیٔ انتظار میں گزر گیا۔ اس دوران میں من حیث القوم اپنی منزل

کا تعین کئے بغیر مسلمان، برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر، جذباتی تحریکوں میں مایوسیوں اور نامرادیوں کا شکار بنتے رہے! اور پھر وہ دن آیا جب کہ مایوسیوں کی اس تاریک رات میں ایک چراغ روشن ہوا اور یہ آواز سنائی دی۔

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

حکیم انقلاب کی دعوتِ قرآنی یہ حکیم انقلاب علامہ اقبال کی آواز تھی جو مشرق و مغرب کے علمی میکدوں سے نامراد لوٹا تھا اور قرآن کے باب عالی پر دستک دی تھی، اور یہاں سے مالا مال ہونے کے بعد اُس نے قوم کو جوشِ مسرت سے پکارا تھا کہ

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام — شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
از تتب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

اور پھر واضح کیا تھا کہ

گر تو میخواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور قومی ذلت اور نامرادیوں کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

خوار از مہجوریٔ قرآن شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

زندگی کی عظیم حقیقتوں کی یوں نقاب کشائی کرتا یہ دانائے راز ایک دعوت لے کر آگے بڑھا۔ یہ قوم کی بگڑی بنانے کی دعوت تھی۔ مردانہ وار کارزارِ حیات میں رزم آرائی کا پیغام تھا کس قدر سوز و ساز، تڑپ اور خلش مضمر تھی اس دعوت میں جب اس نے کہا۔

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

یہی وہ مبارک و مسعود شخصیت تھی جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری سے وہ قرآنی بصیرت عطا ہوئی جس نے ہر کٹھن مرحلے پر ملت کے لیے نشانِ منزل اور قندیلِ راہ کا کام دیا۔

اسلامی قومیت کا تصور: علامہ اقبال اپنے مقام سے بخوبی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ عملی سیاسیات میں

قوم کی رہنمائی ان کے طبعی رجحان سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ان کا مقام ایک عظیم القدر مفکر کا مقام ہے۔ اور اسی مقام سے وہ قوم کو اس کی حقیقی منزلوں کا سراغ دے سکتے ہیں۔ ایک مفکر اسلام کی حیثیت سے انھوں نے سب سے پہلے جس سیاسی مسئلہ کی اہمیت کو بھانپا وہ قومیت کا مروّجہ مغربی تصوّر تھا۔ یہ تصوّر اسلام کے اس نظریہ قومیت سے براہ راست متصادم ہوتا تھا جس کی رو سے قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہوتی ہے۔ نہ کہ وطن، رنگ یا نسل کی اساس پر۔ مزید برآں علامہ اقبالؒ ان ہولناک نتائج سے بھی پوری طرح باخبر تھے جو قومیت کے مغربی تصوّر کو قبول کرنے کی بنا پر ملت اسلامیہ کے مستقبل کو لاحق ہو سکتے تھے چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے یہی نعرۂ جہاد بلند کیا کہ وطن مسلمانوں کی قومیت کی اساس نہیں بن سکتا۔ انہوں نے پوری قوت سے یہ آواز بلند کی کہ

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطنی قومیت کے اس بت کو جس کے حضور میں بڑے بڑے فقیہانِ حرم سجدہ ریز نظر آتے تھے، ضربِ کلیمی سے یوں پاش پاش کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہہ کر اپنی ملت کو اس کے گم گشتہ مقام سے خبردار کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

نیشنلزم کے دلفریب سومنات کے چنگل سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے لیے اس حکیم انقلاب کی صدائیں برابر اس برصغیر کی فضا میں گونجتی رہیں۔ وہ اپنوں اور بیگانوں سب کو ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی کی اصل حقیقت سے روشناس کرتے چلے گئے اور پوری بلند آہنگی سے انھوں نے نعرہ بلند کیا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمارؐ نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

پھر ایک دن ان کی نگاہوں نے یہ جگر پاش منظر بھی دیکھا کہ چوٹی کے علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین اپنی ملت کو نیشنلزم کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس قیامت پر آنسو بہاتے اور سسکیاں بھرتے

ہوئے انھوں نے یوں نوحہ خوانی کی۔

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

بہ خوش دیرے بنا کردند اینجا — پرستد مومن و کافر تراشد

یہ سسکیاں اور اشکباریاں ابھی رُکی نہ تھیں کہ بدایوں کی جامع مسجد کے منبر سے شیخ الہند کا یہ نعرہ بلند ہوا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ایک چوٹی کے عالم دین کا برسرِ منبر یہ اعلان ایک نشتر تھا جس نے بسترِ مرگ پہ سسکتے ہوئے حکیم انقلاب کا سینہ چھلنی کر دیا۔ اس کے قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آہِ آتشیں کی صورت میں یوں لبوں تک آئی۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسینؔ احمدؔ ایں چہ بوالعجبی ست

سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی ست

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اور اس کے بعد ان کا جو تاریخی بیان منظر اشاعت پر آیا تھا، "معرکۂ دین و وطن" میں ہمیشہ ایک شاہکار کی حیثیت حاصل رہے گی۔

بانگِ رحیل ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ الٰہ آباد) کی مسندِ صدارت سے ملّت کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ خطبہ صدارت ہماری تاریخ میں ایک نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گنگ و جمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر ایک حکیم انقلاب نے قوم کو اس کی گم گشتہ منزلِ مقصود کا سراغ دیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ خطاب ایک آذانِ سحر تھی جو فضاؤں میں گونجی اور اسے سن کر خوابیدہ قوم انگڑائیاں سی لینے لگی۔ اقبالؒ نے کہا تھا۔

"ہندوستان کی تاریخ میں جو نازک وقت آج مسلمانوں پر آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں ان کی یہ تنظیم ملّت اسلامیہ اور ہندوستان، دونوں کے حق میں مفید ثابت ہو گی ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس ملک کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کے فیض سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی جس سرزمین کے ساتھ ہماری زندگی اور موت وابستہ ہو چکی ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک فریضہ عاید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر ایشیا، اور بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر اسلام کے لیے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّت اسلامیہ اس لیے ہمیں ہندوستان کے مسئلے کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے ہی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا؟ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے، اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت وحیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر پڑیگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عاید ہوتے ہیں ہم ان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لیے ہم منظم طور پر عزم نہ کریں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملّی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم، متحد اور ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھیرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن سے ہماری ملّت کی زندگی اور موت وابستہ ہے، بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتے کے بارے میں ناامید نہیں لیکن مجھے تو کچھ نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جُداگانہ محاذ قائم کر کے اس کا مقابلہ کرنا پڑے۔ ایسے خطرناک حالات میں آزاد لائحہ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصول مقاصد کے لیے تُلی بیٹھی ہوں۔"

(خطبہ صدارت الہ آباد ـــــ بحوالہ طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

اور پھر اس کے لیے لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

"اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور زندہ پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے، جو وہ پیش کرتا ہے، نورِ بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے" (ایضاً)

اور ازاں بعد اس دانائے راز کی شدّتِ آرزو یوں لبوں پر آئی۔

"میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے" (ایضاً)

اس الگ خطۂ زمین کا حصول اور اس جُداگانہ مملکت کا قیام کیوں اشد ضروری تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے

علّامہ موصوف نے اسی خطبہ میں فرمایا۔

> اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوّت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اُسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے . . . اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی (ایضاً)

اُنھوں نے مسلمانوں کی قومی اُمنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی مزید وضاحت کی اور کہا۔

> یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے اس لیے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لیے بیٹھے ہیں اور جس سے ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں غلبہ اور تسلّط حاصل ہو۔ (ایضاً)

اقبالؒ نے اس تاریخی خطبہ میں جو اہل حقائق پیش کئے وہ ملّت کے لیے تنظیم و عمل کا پیغام بھی تھے اور دعوتِ انقلاب بھی کاروانِ ملّت کے لیے اس میں منزل کی نشان دہی بھی تھی اور بانگ رحیل بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی انوارِ قرآنی سے فیض یاب نگہِ بصیرت پورے یقین و اعتماد سے دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا وہ مستقبل کے افق پر محسوس و مشہور اور زندہ جاوید تاریخی حقائق کی صورت میں جلوہ بار ہو کر رہے گا۔

اسلام — ثبات و تغیر کا حسین امتزاج

اقبالؒ نے ہمیں نہ صرف پاکستان کا تصوّر عطا کیا بلکہ اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ جس اسلامی دستورِ حیات کو اس جداگانہ مملکت کی رُوح بننا ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ یہی خصوصیات ہیں جنہیں نگاہوں سے اوجھل کر کے ہم حصولِ پاکستان کے بعد پے در پے ناکامیوں، مایوسیوں اور گوناگوں الجھنوں کی گردشِ دولابی کا شکار رہے۔ سنئے کہ انہوں نے اپنے خطبات — تشکیل الٰہیات جدید — میں اس حقیقت کو کس قدر نکھار کر منظرِ عام پر پیش کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کُلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر مشتمل ہو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی

> زندگی کے نظم و ضبط کے لیے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس کے لیے دنیا میں، جہاں تغیر کا دَور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تھا اقبالؒ کا وہ دانائے راز اور حکیم انقلاب جس نے سرسید کی پھیلائی ہوئی روشنی میں کاروانِ ملت کے ذوقِ سفر کا رُخ اس کی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔ جہاں سرسیدؒ نے صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قوم کے فکر و بصیرت سے اپیل کی اور جذبات کے دھاروں پر بہنے کی بجائے زندگی کی عملی حقیقتوں سے عہدہ برا ہونا سکھایا۔ وہاں اقبالؒ نے بھی اپنی حیات آفریں دعوت علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کی۔ یہی خوش گوار اور خوش آئند انقلاب تھا جو مدتوں کے بعد ہماری قومی زندگی میں بپا ہوا۔ یعنی قوم پہلی بار جذبات کی ہنگامہ خیزیوں اور پُر فریب نعرہ بازیوں سے دامن کشاں ہو کر سنجیدگی سے اپنے مقام اور منزل کو سمجھنے پر مائل ہوئی۔ اگر تاریخی نشیب و فراز کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ذہنی انقلاب، معمولی کام نہ تھا بلکہ بہت بڑی معجز نمائی تھی جو خدائے ذوالمنن کی عنایات بے غایات کے صدقے میں ہمیں نصیب ہوئی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

قائدِاعظم ـــــــ محمد علیؒ جناح

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا

سرسیدؒ و اقبالؒ کی مساعیٔ جمیلہ کے بعد جو عظمت آفریں شخصیت ہمارے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لیے آگے

بڑھی اور اسے ساحلِ مراد سے ہمکنار کر کے دم لیا وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح تھے تاریخ شہادت دے گی کہ اس قائدِ جلیل کی شانِ قیادت نے اپنی تگ و تاز کے پورے دور میں ایک لمحہ کے لیے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جی جیسی شہرہ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈر شپ کا سکہ جمانے کے لیے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیسا حیرت انگیز ہے سیاسیاتِ ہند کی تصویر کا یہ دوسرا رخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لیے میدان میں آئے اور انھوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لیے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ زندگی کے آخری سانس تک انھوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی ہے جناح کی عظمت کا وہ امتیازی نشان جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصولِ پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔

قیادتِ ملی اور اقبال کا حسنِ انتخاب

اقبالؒ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک مفکر کے مقام سے تجاوز کر کے اسلامیانِ ہند کے منصب قیادت کو اپنائیں۔ ان کے خلوص کا تقاضا یہی ہو سکتا تھا۔ ان کی نگاہیں اس قائد کی تلاش میں تھیں جو قومی زندگی کے لئے اور نازک ترین مرحلوں میں قیادت کی پیچیدہ ذمہ داریوں سے دلنواز انداز سے عہدہ برا ہو سکے اور کوئی اس کے حسنِ سلوک پر حرف گیری کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ صرف جناح تھے جو ان کے حسنِ انتخاب کے شایانِ شان قرار پا سکے اور ان کی کوششوں سے قوم کو وہ قائدِ اعظم مل گیا جس کے حسنِ تدبر کے صدقے میں پاکستان جیسی عظیم مملکت کا وجود نقشۂ عالم پر مرتسم ہوا۔ ۱۔ جون ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کے نام ایک مکتوب میں اقبالؒ نے یہ لکھا تھا کہ

> ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں صرف آپ ہی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔

یہ تھیں وہ امیدیں جو اقبالؒ نے قوم کی طرف سے جناح سے وابستہ کیں اور تاریخ نے شہادت دی کہ جناح نے انھیں بحسن کمال پورا کر دکھایا۔ اقبالؒ کے خطاب الٰہ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناح ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور اس کے بعد اس قرارداد کو حاصلِ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ تگ و تاز شروع ہو گئی تھی جو ۱۹۴۷ء میں حصولِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس مدت میں قائدِ اعظم کی معرکہ

آرائیوں کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل باب ہے[1]۔ اور ایک الگ داستان۔ یہاں ہم قائدِ اعظم کے بعض اہم خطابات سے ان مقاصد کو روشنی میں لائیں گے جو تحریکِ پاکستان کے لیے اساسی درجہ رکھتے ہیں۔

انھوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تقریب پہ حاضرین سے پہلے یہ سوال کیا کہ

> وُہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وُہ کون چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے؟ اور وُہ کون سا لنگر ہے جس کی بدولت اس اُمّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اور پھر خود ہی ان اہم سوالات کے جواب میں فرمایا۔

> وُہ بندھن اور وُہ رشتہ، وُہ چٹان اور وُہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی ـــ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک اُمّت۔

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ

> ہندو اور مسلمان، خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں کبھی ایک قوم کے اجزا نہیں بن سکتے۔ وُہ ہمیشہ دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں . . . . پاکستان تو اُسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ (تقاریر جناح۔ حصّہ دوم)

اور پھر اس کے بعد (۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

> ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۵)

۱۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ لاہور) میں تحریکِ پاکستان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے انھوں نے پنجاب کے مسلم طلباء کو ایک نئے عزم اور تازہ ولولوں سے سرشار کر دیا۔ اس تقریر میں

---

[1] اس تفصیل کا ایک حصّہ "قائدِ اعظم" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعتوں میں سامنے آچکا ہے۔

انھوں نے فرمایا:

> پاکستان کے تصور کو، جواب مسلمانوں کے لیے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی سے یہ آواز افضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت معرضِ وجود میں آگئی ہے جو اسلام کی عظمتِ رفتہ کو از سرِ نو پھر زندہ کرے گی۔ (ایضاً ـــ ص۵۹)

۱۸۔ جون ۱۹۴۵ء کو قائدِ اعظم ایک بار پھر صوبہ سرحد کے شاہین بچوں کو ایک اہم پیام انقلاب دے رہے تھے۔ اس پیغام میں انھوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی وساطت سے اسلام کے نونہالوں پر واضح کیا تھا کہ

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (درحقیقت) مراد وہ مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے ہم خود ہی متمتع نہیں ہوں گے بلکہ ہمارے ساتھ اوروں بھی فیضیاب ہوں گے۔ . . . . ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ (ایضاً ـــ ص۳۶۷)

مملکت کا اسلامی تصور

قائدِ اعظم کے خلاف مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ اسلام کے معاملہ میں نابلد سے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے مخالفت کے اس گھناؤنے انداز کا جواب ہمیشہ خود اعتمادی کی مسکراہٹ سے دیا کیوں کہ ملت کے عظیم ترین قائد کی حیثیت سے انھوں نے اپنے قافلے کو جس اسلامی منزل کی طرف آگے بڑھا تھا اس کی موجودگی میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اسلام کے زندہ پائندہ حقائق سے بے خبر رہتے۔ یہ درست ہے کہ قائدِ اعظمؒ کو فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ تھا لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و برتری کا تعلق ہے انھوں نے اس کی روح تک کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے گہرے اسلامی مطالعہ کا اندازہ اس انٹرویو سے بخوبی ہو سکے گا جو انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے طلباء کو دیا تھا۔ بڑے اہم سوالات کئے تھے ان طلباء نے اور ہم سطورِ ذیل میں اس سلسلۂ سوال و جواب کو بعینہٖ پیش کرتے ہیں جو اورینٹ پریس کی رپورٹ کے حوالے سے اپریل ۱۹۴۲ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔

سوال: مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب: اشتراکیت، بالشویت یا اس قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک دراصل سلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں ان میں اسلام کے اجزا کا سارا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال: ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصے میں قائد اعظمؒ نے جو کچھ کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں ہماری زندگی میں پیدا شدہ تمام مشکلات و موانعات کا نکھرا ہوا حل موجود ہے۔ اور اس سے وہ تمام الجھنیں اور پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں جو اسلامی دستور اور اسلامی مملکت کے سلسلے میں ہمارے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ قائد اعظمؒ نے جواباً فرمایا تھا۔

جواب: ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز۔ تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ

اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

سنجیدہ فکر کا مطالبہ کیا صدیوں کی ملوکیت کے بعد ایک مملکت کو اسلامی بنانے میں جو الجھنیں حائل رہی ہیں انہیں ختم کرنے کے لیے یہ الفاظ قندیل راہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے؟ اگر ملت جذبات پرستی سے بالاتر ہو کر حسن نیت اور خلوص فکر کی روشنی میں اپنا مستقبل متعین کرنا چاہے تو اسے لامحالہ ان الفاظ کو مشعل راہ بنانا پڑے گا اور اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہ ہو سکے گا۔ سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے اس بدنصیب قوم کو جذبات پرستی کی تند آندھیوں اور مسلک تقلید کی گہری تاریکیوں سے نکال کر فکر و بصیرت کی روشنی میں سفر زندگی کے قابل بنایا تھا لیکن قوم کی بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ حصول پاکستان کی فاتحانہ معرکہ آرائی کے بعد جب قیادت کا میدان خالی ہو گیا تو قوم کے

جذبات سے کھیلنے والے مُفاد پرست عناصر پھر آگے بڑھ آئے۔ اور ہمارے سب سے بنیادی مسائل کو بھی جو انتہائی سنجیدہ فکر کے محتاج تھے جذباتی رجحانات کے سپرد کر دیا اور اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

سرسیدؒ کی کامیاب قیادت سے قبل بھی ہمارے عوام مدتوں جذباتی شورشوں میں مگن چلے آئے اور ان شورش پسندیوں نے ان کی اجتماعی قوت کو مضمحل بنا کر رکھ دیا سرسیدؒ کی صحت مند اور مضبوط قیادت نے بے نتیجہ شورشوں اور ہنگاموں کی اس نمائش کو ختم کیا اور افرادِ ملت میں یہ صلاحیت بحال کی کہ وہ مسائل زندگی سے خالص عقل و فکر کی سنجیدگی کے ذریعے عہدہ برا ہوں۔ ہنگامہ خیزیوں اور زوال پذیریوں کے اس ماحول میں یہ کارنامہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ سرسیدؒ کے بعد اقبالؒ آئے اور اپنی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ باریوں سے ہر نشیب و فراز میں افکار تازہ کی روشنی پھیلا دی اور سب کا رُخ نشانِ منزل کی طرف پھیر دیا۔

قومی زندگی کی یہ منزل بڑا ہی کٹھن مرحلہ ثابت ہوئی۔ یہاں سیاست کے مغربی تصورات نے ذہنوں پر پورا تسلط جما رکھا تھا۔ اگرچہ اقبالؒ کے انقلاب آفریں نغمے ان تصورات کا جادو توڑ چکے تھے لیکن ایوانِ حکومت کا ہر فیصلہ انہی کی رُو سے طے پاتا تھا اور بین الاقوامی دائروں میں بھی انہی تصورات کی کارفرمائی قائم تھی۔ یہ شرفِ عظیم صرف قائدِ اعظمؒ کی قسمت میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ لے کر ان بارگاہوں میں داخل ہوں اور دلائل و براہین کی بے پناہ اور بے مثال قوت سے نہ صرف مروجہ سیاسیات کے مُسلّمہ ضابطوں کو غلط ثابت کر دیں۔ بلکہ انگریز اور کانگریس جیسی عظیم الشان قوتوں کو اپنے دعوے کی عظمت و صداقت قبول کرنے پر مجبور کر دیں ۔۔۔ آسمان کی نگاہوں نے اس صدی میں فراست اور تدبّر کا اس سے عظیم تر شاہکار نہیں دیکھا اور مملکت پاکستان کا وجود اس فتح مبین کی زندہ جاوید شہادت ہے۔

قائدِ اعظم کے اس شاہکار کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے قومی فکر و شعور کی سنجیدگی کو جو سرسیدؒ و اقبالؒ کی کاوشوں کا نتیجہ تھی بدستور قائم رکھا۔ ان کے مخالفین نے قدم قدم پر عوامی جذبات کو ابھارا لیکن قائدِ اعظمؒ کا ہر پیام اور ہر خطاب فکر و بصیرت کی اسی سنجیدگی کا آئینہ دار تھا۔

> اگر اقوامِ عالم میں حقیقی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جذبات سے کھیلنے کی بجائے حقائق سے عہدہ برا ہونا سیکھو۔

یہ تھا اُس شریفانہ جنگ کا نعرہ جس کا آغاز سرسیدؒ سے ہوا۔ جسے فکرِ اقبال نے توانائیاں بخشیں اور جسے قائدِ اعظم کے حُسنِ تدبّر نے فاتحانہ انجام سے ہم کنار کیا۔ قائدِ اعظم کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ حیات بخش نعرہ جذباتی شورشوں کی ماؤ ہو میں دب گیا۔ یہ عناصر چاہتے تھے کہ قوم کی تعمیری صلاحیتوں کو پھر ان شورش پسندیوں کا شکار بنا دیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے حقیقت پسند جانشینِ ملت کو اس حادثہ سے بچا لیں گے۔

طلوعِ اسلام

سب کنونشن

(سرگودھا)

نمایندگان بزمہائے طلوعِ اسلام کے بالعموم سال میں دو اجتماعات ہوتے ہیں ایک (سالانہ) کنونشن اور دوسری سب کنونشن۔ اس دفعہ "سب کنونشن" کا اجتماع ۹ر نومبر (اتوار) کی صبح، سرگودھا میں ہوا۔ قاعدہ کے مطابق اس اجتماع کا انتظام بزمِ طلوعِ اسلام سرگودھا کے ذمہ تھا۔ کارکنانِ بزم نے اس اجتماع کا انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا کہ سب کنونشن، اچھی خاصی کنونشن ہو گئی۔ مہمانوں کے قیام، اور اجتماعات کے انعقاد کے لئے، سٹیڈیم روڈ پر ایک وسیع بنگلہ حاصل کیا گیا جس کی فضا بڑی سرسبز و شاداب تھی۔ اِرد گرد، ہرے بھرے کھیت۔ وسیع سبزہ زار۔ گھنے اور طویل القامت درخت۔ پختہ صحن۔ شامیانوں سے مسقف، بجلی کے قمقمے۔ پانی کی فراوانی۔ اتفاق سے موسم بھی معتدل تھا جس کی وجہ سے مہمانوں کا قیام اور بھی پُرلطف ہو گیا۔ چک ۴۷ شمالی، کی بزم کے نمایندہ، چوہدری نصر اللہ خان صاحب کے حسنِ اہتمام سے کھانا ایسا پاکیزہ اور خوشگوار تھا جس کی یاد مدتوں تک رہے گی۔ اگرچہ موسم سردی کا تھا لیکن شمعِ قرآنی کے پروانے مُلک کے دور دراز گوشوں سے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے۔ اگر ایک طرف کراچی کے احباب تھے تو دوسری طرف، مردان، پشاور اور ڈیرہ اسمٰعیل خان تک کے نمایندگان شریکِ محفل تھے۔ یہ اجتماعات ایک خاص کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں شریک ہونے والے کسی ذاتی غرض کو لئے ہوئے نہیں آتے۔ وہ خالصتہً لوجہ اللہ، اس مقصد کے لئے جمع ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم کو دور دراز گوشوں تک پہنچانے کی تدابیر پر غور و خوض کیا جائے۔ ان کے سینے میں ایک ہی ولولہ اور ان کے دل میں ایک ہی آرزو ہوتی ہے اور وہ یہ کہ صفحۂ ارض پر خدا کا تختِ اجلال پھر سے اس حسن و خوبی سے بچھے، جس طرح وہ، چودہ سو سال پیشتر

محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے وجہ تابندگیٔ عالم اور سرفرازیٔ آدم ہوا تھا۔ قرآنی رشتے میں پروئے ہوئے، ان ہم آہنگ اور یک رنگ احباب کا اجتماع، بڑا کیف بار اور وجد آفریں ہوتا ہے۔

۱۷ر نومبر کی شام، محترم پرویز صاحب، اپنے رفقاء کے ساتھ، بذریعہ کار، سرگودھا پہنچ گئے۔ ان میں عبداللطیف صاحب نظامی، صدر مجلس عاملہ۔ میاں عبدالخالق صاحب، (آنریری) مینجنگ ڈائرکٹر میزان پبلیکیشنز اور عبدالعلی صاحب رکن بزم طلوع اسلام، لاہور، شامل تھے۔ اس قافلہ کی آمد سے فضا میں زندگی کی لہر ابھر آئی۔ انہوں نے جملہ انتظامات کا جائزہ لیا اور کارکنان کے حسنِ انتظام سے بڑے خوش ہوئے۔ رات تک اور بھی بہت سے احباب پہنچ گئے اور غیر رسمی اجتماعات میں قرآنی فکر کے چرچے ہونے لگے۔

۱۸ر نومبر (ہفتہ) ساڑھے بارہ بجے، بار ایسوسی ایشن کی طرف سے محترم پرویز صاحب مدعو تھے۔ بار روم میں اجتماع ہوا۔ دعوت اگرچہ محدود تھی لیکن ارباب ذوق کے ہجوم شوق کا یہ عالم تھا کہ بار روم میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پرویز صاحب نے، اسلامک آئیڈیالوجی کے موضوع پر احباب سے خطاب کیا اور اپنے مخصوص انداز میں مغربی نظریۂ زندگی اور اسلامی نظریۂ حیات کے فرق کو نمایاں کیا۔ خطاب کے بعد، مختلف سوالات پوچھے گئے جن کے جوابات بڑی خوشگوار اور پُرسکون فضا میں دیئے گئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، نمائندگان بزمہائے طلوع اسلام کا تعارفی اجتماع ہوا، یہ اجتماع بھی اپنے انداز کا بالکل نرالا ہوتا ہے، جس میں احباب، اپنے اپنے انداز میں، اپنا اور اپنی بزم کا تعارف کراتے ہوئے "شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں" کی والہانہ کیفیتیں بیان کرتے ہیں۔

۷½ بجے شب، مجلس استفسارات کا آغاز ہوا۔ اس میں، بزم کے نمائندوں کے علاوہ، شہر کے چیدہ چیدہ ارباب فکر و نظر خاصی تعداد میں شریک تھے۔ چند منٹ میں، کاغذ کے پرچوں پر لکھے ہوئے سوالات، کا سلسلہ بندھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی۔ اس کے بعد، محترم پرویز صاحب نے، قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، ان کے جوابات دینے شروع کئے۔ سوالات مسئلۂ تقدیر سے لے کر نماز کی رکعتوں تک، مختلف اور متنوع موضوعات سے متعلق تھے۔ سامعین کی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رات ڈھلتی جاتی تھی اور سردی بڑھتی جاتی تھی لیکن جب تک مقررتے قریب سوا دس بجے خود ہی اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا، محفل پورے جذب و سکون سے جمی رہی۔

اتوار کی صبح، سب کنونشن کا اجلاس شروع ہوا اور قرآنی فکر کی عام نشر و اشاعت کے سلسلہ میں مختلف تجاویز اور تدابیر پر، پورے خلوص اور آزادی سے بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ تحریک طلوع اسلام کی ایک

خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی چیز راز میں نہیں رکھی جاتی ــــ جس تحریک کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہو، نہ سیاسی پارٹی سے۔ جس کے سامنے کوئی ذاتی غرض یا مفاد نہ ہو۔ اس میں راز ہو کیا سکتا ہے۔ اس لئے اس میں تمام امور پر کھلے بندوں گفتگو ہوتی ہے۔ آخر میں محترم پرویز صاحب نے، اپنی اختتامی تقریر میں، دو تین اہم باتوں کی وضاحت فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ طلوعِ اسلام کوئی سیاسی پارٹی نہیں اس لئے اس نے نہ کبھی عملی سیاسیات میں حصہ لیا ہے۔ نہ حصہ لینے کا کوئی پروگرام ہے' انہوں نے اس پر بڑا زور دیا کہ ہماری طرف سے اس قسم کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیئے جس سے اس سرزمین کے استحکام اور مملکت پاکستان کی سالمیت پر ذرا سی زد پڑنے کا شائبہ تک بھی ہو، انہوں نے کہا کہ ' اور مقاصد کو چھوڑیئے، ایک خطۂ زمین کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے قوموں کو کتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کا اندازہ اس جنگ آزادی سے لگایئے جو الجزائر کے مسلمانوں کو گذشتہ سات سال سے لڑنی پڑ رہی ہے۔ اس لئے ہمیں اس خطۂ زمین کی آزادی اور سالمیت کو متاعِ گراں بہا سمجھنا چاہیئے اور پوری پوری احتیاط کرنی چاہیئے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی انتشار پیدا نہ ہو۔

اس کے بعد، سب کنونشن کی طرف سے اراکین بزم سرگودھا، اور ادارہ کی طرف سے، سب کنونشن کے شرکاء اور ان کی متعلقہ بزموں کے شکریہ کے ریزولیشن پاس ہوئے، اور مخلص دعاؤں کے ہجوم میں یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔

اقبال اور قرآن

فکرِ اقبال کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟

اقبال نے قرآنی تعلیم کو کس حسین انداز میں پیش کیا ہے؟ اس موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے

قیمت ـــــــ دو روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷/بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

جامع رپورٹ

بزمہائے "طلوعِ اسلام" بابت ستمبر ۱۹۶۱ء

بزموں کی یہ رپورٹ ماہ نومبر کی اشاعت کے لیے تھی۔ لیکن نومبر کا پرچہ شائع نہ ہونے کے باعث یہ اس مشترکہ شمارہ (بابت نومبر و دسمبر) میں شائع کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

پشاور درس مفہوم القرآن کا ٹیپ ریکارڈ ہر اتوار کو باقاعدگی سے شام کے پانچ بجے سے چھ بجے تک سنایا جاتا ہے پمفلٹ "عورت کی مظلومی" اور "ہم میں کریکٹر کیوں نہیں؟" تعلیم یافتہ طبقہ میں تقسیم کئے گئے۔ جس کا اثر نہایت خوش گوار رہا ہے۔

کوئٹہ بزم کے ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں جن میں درس لغات القرآن مستقل طور پر دیا جاتا ہے۔ ممبران مختلف موضوعات پر قرآن کریم کی روشنی میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ سابقہ اجتماعات میں "اسلامی نظام میں معاشیات" کلامِ اقبال، اسرارِ خودی" قرآن فہمی کے اصول" اور "ختم نبوّت" کے عنوانات پر حاضرین نے قرآنی نقطۂ نظر سے تبادلۂ خیالات کیا۔

احباب کی سہولت کے لیے متفقہ طور پر طے پایا ہے کہ بزم طلوع اسلام کوئٹہ کے اجلاس اب بروز جمعہ بعد نماز بوقت ۳½ بجے ہوا کریں گے کوئٹہ کے احباب ۷/ے سپرنٹنڈنٹ کالونی وائٹ روڈ پہ حسن عباس رضوی صاحب کے مکان پر تشریف لائیں۔

پنڈ دادن خاں لٹریچر کی تقسیم جاری ہے۔ بزم کے سرگرم رکن حافظ عبدالمجید صاحب قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں خوب سرگرم ہیں۔ گذشتہ اجلاس میں ممبران کو باقاعدہ حاضری کی پُر زور تاکید کی گئی ——
طلوع اسلام کی خریداری بڑھانے پر زور دیا گیا نتیجتاً دو احباب نے رسالہ جاری کرانے کا وعدہ کیا۔

بُورے والا ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ درس لغات القرآن باقاعدگی سے جاری ہے۔ لوگوں کو تحریک سے متعارف کرانے کے لیے کتب کی تقسیم افہام و تفہیم اور ذاتی ملاقاتوں کا

سلسلہ حسب سابق کامیابی سے چل رہا ہے طلوع اسلام کا ایک نیا خریدار بنایا گیا۔

پنج کسی: بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ لغات القرآن و مفہوم القرآن کے درس جاری ہیں پمفلٹوں کی تقسیم حسب معمول ہو رہی ہے۔

واہ کینٹ: بزم کے ایک سرگرم رکن جناب صوبیدار الٰہی یار خاں صاحب کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے، ان کے اعزاز میں مورخہ ۶ ستمبر کو الوداعی پارٹی دی گئی جس کے بعد احباب کا مختصر سا اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ماہانہ اجلاس آئندہ ہر ماہ کے دوسرے ہفتہ میں ہوا کریں گے مورخہ ۲۳ ستمبر کو بزم کا ایک خاص اجلاس منعقد ہوا جس میں اراکین بزم کی تعداد بڑھانے اور طلوع اسلام کے نئے خریدار بنانے کے سلسلے میں ضروری فیصلے کئے گئے۔ مجلس عاملہ کی طرف سے موصول شدہ پمفلٹ "عورت کی مظلومی اور تم میں کریکٹر کیوں نہیں" کی تقسیم کی گئی۔

لاہور: بزم کے ماہانہ اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ نمائندہ بزم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کا استعفےٰ (بحیثیت نمائندہ بزم) بامر مجبوری قبول کیا گیا۔ نئے نمائندہ کے انتخاب کے سلسلے میں جناب عبداللطیف نظامی صاحب کا نام تجویز کیا گیا جس کی احباب نے تائید فرمائی۔ لہٰذا اتفاق رائے سے انھیں آئندہ کے لیے بزم لاہور کا نمائندہ منتخب کر لیا گیا۔

رسول نگر: ۱۰ ستمبر قاضی حفیظ الدین (مرحوم) کی وفات حسرت آیات نے بزم سے اس کا شفیق سرپرست اور نمائندہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ قاضی مرحوم بزم قرآنی کے سبیل القدر فرد اور یہاں کے ممتاز رئیس تھے۔ اس سلسلے میں ۲۰ اکتوبر کو بزم کا تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں مرحوم کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔

چک جمرہ: ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا سلسلہ شہر میں بھی جاری ہے حالات بڑے سازگار ہو رہے ہیں۔

شکر گڑھ: بزم کا اجلاس ۱۷ ستمبر کو منعقد ہوا۔ نمائندہ بزم نے اپنی تقریر میں لغات القرآن سے قرآنی الفاظ کے مفہوم و معانی سامنے لانے پر زور دیا اور واضح کیا کہ مفہوم القرآن سے کما حقہٗ مستفید ہونے کے لیے قرآن کریم کے الفاظ کے معانی لغات القرآن سے سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

ممبران سے اپیل کی گئی کہ طلوع اسلام کی خریداری زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔

ڈیرہ غازی خان: پمفلٹ "عورت کی مظلومی" خواتین کے تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقہ میں تقسیم کیا گیا۔ مفہوم القرآن

کے خریداروں کی تعداد دس تک پہنچائی گئی۔ مزید کوششیں جاری ہیں۔

قرآنی احباب کی وفات حسرت آیات

یکے بعد دیگرے، بزم قرآنی کے دو مخلص احباب ـــ ڈاکٹر عبدالحنان (زرولی ضلع مردان) قاضی حفیظ الدین رسول نگر ـــ کی وفات ایک سانحۂ الم انگیز ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ہر دو احباب نے جس قابل قدر ایثار سے کام لیا اس کی یاد قرآنی احباب کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ عوام کے سچے غم گسار اور خادم خلق کی حیثیت سے مقامی حلقوں کی بیوائیں، یتیم اور نادار انھیں فراموش نہیں کر سکیں گے۔

ادارہ طلوع اسلام اس حادثہ سے خاص طور پر متاثر ہے اور دلی رنج و ملال اور مخلصانہ تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہے کہ وہ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل سے بہرہ ور فرمائے۔ (ادارہ)

سلیم کے نام خطوط

تین خوبصورت جلدوں میں

اپنے طرز کی واحد کتاب ہے۔ انسان کی عملی زندگی کے متعلق کونسا سوال ہے جس پر اس میں بحث نہیں کی گئی۔ قیمت جلد اوّل۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم۔ چھ روپے۔ جلد سوم چھ روپے

میزان پبلی کیشنز لمیٹڈ

۲۷ بی ۔ ۔ ۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔ ۔ ۔ لاہور

نقد و نظر

۱۔ تاریخ ادب عربی مسلمانوں کے لئے عربی زبان کی اہمیت پر زور دینا تحصیل حاصل ہے۔ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کا رشتہ دین سے وابستہ ہے اور دین سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک قرآن کریم کو براہ راست نہ سمجھا جائے۔ بنا بریں عربی زبان کے سیکھنے اور سکھانے کے لئے جو مفید کوشش بھی کی جائے درخور تحسین ہے۔ مولانا طاہر سورتی صاحب نے اس مقصد کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور وہ ہر وقت اس دھن میں لگے رہتے ہیں۔ انھوں نے جہاں جماعتوں کے لئے عربی قواعد اور نصاب کی مختصر کتابیں لکھی ہیں وہاں عربی ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے استاذ احمد حسن زیات کی کتاب "تاریخ ادب عربی" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے بڑے حسن ذوق سے ٹائپ میں چھاپا ہے کتاب قریب پونے سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور مجلد کی قیمت ۲۱/- روپے ہے۔

ادب، اور وہ بھی عربی ادب کی کتابوں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں، اس کے لئے قابلیت اور محنت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ طاہر صاحب کے ترجمہ میں ان دونوں خصوصیات کی نمایاں جھلک موجود ہے۔ اس کتاب میں دورِ جاہلیت سے لے کر عصر حاضر کے نامور ادباء اور ان کے کارناموں کا عمدہ تعارف آگیا ہے اور اردو دان طبقہ کو طاہر صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اس قدر کاوش سے ان ادبی ذخائر کو ان کے حیطۂ دسترس تک پہنچا دیا ہے۔

تاریخ عربی ادب کی کوئی کتاب ہو وہ تشنۂ تکمیل رہ جائے گی اگر اس میں ہمارے ہاں (تقسیم سے پہلے کے ہندوستان) کے ادیب شہیر مولانا محمد سورتی مرحوم کا تذکرہ نہ ہو۔ ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اس کتاب میں طاہر صاحب نے ان کے تذکرہ کا اضافہ کر دیا ہے (اگرچہ وہ نسبتاً مختصر ہے) ورنہ ہمیں خدشہ تھا کہ ان پر یہ خیال غالب نہ آجائے کہ میں اپنے والد کا ذکر کیا کروں؟

۲۔ عورت کا عائلی مقام

محترمہ ممتاز جہاں صدیقی صاحبہ نے عائلی قوانین کا تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا ہے اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ حکومت کا یہ اقدام ان قوانین کو قرآن کریم کے قریب لے آیا ہے۔ انداز کم و بیش وہی ہے جو طلوع اسلام میں پیش کیا گیا تھا۔ اسلوبِ بیان نہایت سلجھا ہوا اور عالمانہ۔ ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ ہمارے ہاں ایسی خواتین موجود ہیں جو اتنی بلند سطح پر بات کر سکتی ہیں۔ کتاب چھوٹے سائز کے ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور خاتون اکیڈیمی، بہار کالونی، جمشید روڈ، کراچی سے تین روپیہ میں مل سکتی ہے۔

INDIA WINS FREEDOM
THE OTHER SIDE

اقوام عالم کی تاریخ میں تخلیق پاکستان ایک عظیم واقعہ ہے لیکن کس قدر مقام تاسف ہے کہ اس وقت تک تحریک و تشکیل پاکستان کی ایسی مستند تاریخ نہیں لکھی گئی جو حقائق کو ان کے اصلی رنگ میں بالتفصیل پیش کر سکے۔ لیکن اس ضمن میں اتفاق سے ایک ایسا "حادثہ" پیش آگیا جس نے بڑے خوشگوار نتائج پیدا کر دیئے، اور وہ جو کہتے ہیں کہ ——— عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد ——— وہ ایک حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے آزادئ ہند کے نام سے کتاب لکھی جس میں تحریک پاکستان اور قائد اعظم کے کردار کو بڑے معکوس انداز میں پیش کیا گیا۔ اس پر تحریک پاکستان کے ایک قدیم شیدائی اور سرگرم کارکن، محترم عبدالوحید خاں صاحب کی حمیت اور جذبۂ حق گوئی جوش میں آئے اور انھوں نے تقسیم ہند کے نام سے ایک عمدہ کتاب شائع کر دی۔ یہ کتاب تھی تو مولانا آزاد کی کتاب کے جواب میں لیکن اس میں تحریک پاکستان کا پورا اور صحیح پس منظر سامنے آگیا لیکن اس کتاب سے صرف اردو داں طبقہ ہی مستفید ہو سکتا تھا، اور ضرورت اس امر کی تھی کہ انگریزی داں طبقہ اور بیرونی ممالک کے ارباب علم و سیاست بھی ان حقائق سے روشناس ہوں۔ اس ضرورت کو بھی خود جناب مصنف موصوف ہی نے پورا کر دیا۔ زیر نظر کتاب انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ پلان کے اعتبار سے تو یہ کتاب "تقسیم ہند" کے انداز کی ہے، لیکن اس کا ترجمہ نہیں، نہ ہی اس کا مثنیٰ۔ اس کی حیثیت ایک اور مکمل تصنیف کی سی ہے اور اس میں بہت سے اضافے بھی ہیں۔ اور ان غلطیوں کی نشاندہی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا جو تقسیم ہند کے وقت خود ہم سے سرزد ہوئی ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس طرح کم از کم ایک کتاب تو ایسی سامنے آگئی جسے ہم اپنے بیگانے، ہر ایک کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دے سکتے ہیں کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان کیوں اور کیسے وجود میں آیا تھا، اور اس کے راستے میں کیا کیا موانع تھے اور کون کون روک بن کر کھڑا تھا۔ ہم اربابِ بست و کشاد سے سفارش کریں گے کہ وہ بیرونی ممالک میں اس کتاب کی عام اشاعت کا انتظام کریں۔ اس سے پاکستان

سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔

کتاب پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی نے ایسے سلیقے سے شائع کیا ہے کہ صوری لحاظ سے یہ بیرونی ممالک کی کسی اچھی کتاب سے کم تر نہیں۔ ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت بیس روپیہ۔

نمونہ لغاتِ اردو

ترقی اردو بورڈ، کراچی اردو کا ایک جامع لغت مرتب کر رہا ہے جس کے نمونے کے چند اوراق بغرضِ تبصرہ موصول ہوئے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ اس مرحلۂ دشوار گزار میں آگے بڑھنے سے پہلے، اربابِ فکر و نظر کی آرا اور مشوروں سے استفادہ کیا جا سکے۔ یہ مقصد بڑا مبارک ہے۔

اس لغت کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ متداول لغات کے برخلاف، اس لغت میں جدید اصول کے مطابق تمام مواد براہِ راست مستند ادب سے اخذ کیا گیا ہے اور حتی الامکان ہر لفظ کے استعمال کی مثال ہر دور سے پیش کی گئی ہے۔ اس طرح لفظ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے کہ یہ کہاں سے چلا اور ہماری زبان میں کب سے یا کب تک پایا جاتا ہے۔ اردو زبان کے ایک جامع لغت کی ضرورت کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں لغت زیرِ ترتیب کے لئے جو انداز اختیار کیا جا رہا ہے (اور جسے اس کی خصوصیت کہا گیا ہے) وہ "اسراف" ہے جس کی (کم از کم) لغات میں ضرورت نہیں۔ مثلاً اس میں سب سے پہلا لفظ "اَب" ہے۔ اس کے پہلے معنی یہ دیئے گئے ہیں۔

(عموماً) اس وقت۔ فی الحال۔

اس کے بعد ان معانی کی تائید میں مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً

اگر گیان ہے تو سمجھ اَب کچھ

۱۶۳۴ سب رس۔ ۲۴

سب گیا دن شام کو آیا نہ پاس
یمن کے قلزم میں اب ڈوبی ہے آس

۱۷۴۴ ولی ۹۸

اس میں شبہ نہیں کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ۱۶۳۴ء میں بھی اس لفظ (اب) کے یہی معنی تھے اور ۱۷۴۴ء میں بھی لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کونسے ایسے مختلف فیہ معانی ہیں جن کی تائید کے لئے اس قسم کی اسناد کی ضرورت تھی اور اگر یہ سندات پیش نہ کی جائیں تو ان معانی پر اعتراض ہو جاتا! یا بات ادھوری رہ جاتی۔ اگر اردو

الفاظ کی تاریخ مرتب کرنا مقصود ہو، تو اس قسم کی تحقیق اور اسناد ضروری ہوں گی۔ لغت میں اس کی ضرورت نہیں۔ اگر لغت میں یہی انداز اختیار کیا گیا تو نہ معلوم اس کی تکمیل میں کتنے برس لگ جائیں اور کس قدر روپیہ صرف ہو جائے۔ اور اس کے بعد یہ لغت جس قدر ضخیم ہو جائے گا، اسے کتنے لوگ خرید سکیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی زیر نگرانی انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام کے اردو ترجمہ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ارباب علم کے سامنے ہے۔ قوم کو اس وقت ایسی چیزیں دینی چاہئیں جن سے اس کے رُکے ہوئے کام چل نکلیں۔ اس قسم کی تحقیقات فرصت اور فراغت کے زمانے کی باتیں ہیں۔ انھیں سردست ملتوی رکھنا چاہیئے۔ زیر نظر لغت میں الفاظ کے معانی عام فہم انداز میں بیان کر دینے چاہئیں اور مشکل مقامات پر ان کے استعمال کی مثالیں ایک آدھ فقرہ میں دیدینی چاہئیں۔ البتہ فارسی، عربی (بالخصوص عربی) زبان کے الفاظ کے معانی کے لئے اس لغات کا حوالہ دینا ضروری ہو گا جہاں سے وہ معانی لئے گئے ہیں۔

۲۔ طباعت کا انداز یہ رکھا گیا ہے۔ (مثلاً)

اَبَدی (رفت ا، ب، ی مع) صف

اس سے مطلب ہے۔ الف اور ب پر فتح اور ی معروف۔ اور یہ صفت ہے۔ ہمارے نزدیک یہ انداز الجھاؤ پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اب اعراب دار ٹائپ عام طور پر مل (دیا بن) سکتا ہے۔ الفاظ کو پورے اعراب کے ساتھ چھاپا جائے (مثلاً اَبَدی) اس سے بات صاف ہو جائے گی۔ البتہ اس میں پروف بڑی احتیاط سے دیکھنے پڑیں گے۔

۴۔ تہذیب الاخلاق

اس نام کے ساتھ سرسیدؒ کا نام قدرۃً سامنے آجاتا ہے جو اس شہرۂ آفاق ماہنامہ کے بانی اور ایڈیٹر تھے اور جس نے اس دور میں مسلمانوں کی فکری اور عملی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا، اب اسی فکر کے حامیوں نے لاہور میں ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے اور یہ ماہنامہ اُسی ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ مرتب اس کے سید ہاشمی فرید آبادی ہیں۔ سالانہ چندہ دس روپے۔ قیمت فی شمارہ ایک روپیہ مقام اشاعت، ۳۰، ڈیوس کورس روڈ۔ لاہور

تہذیب الاخلاق (مرحوم) کے مقاصد کے احیاء (اور تکمیل) کے لئے اس زمانے میں اُس کا دوبارہ اجراء بہت طلب مرحلہ ہے۔ اس کا ابھی پہلا شمارہ ہی موصول ہوا ہے اس لئے اس کی رفتار کا اندازہ لگانا قبل از وقت ہے۔ ہم اپنے اس جدید ہمعصر کا بدل خیر مقدم کرتے ہیں اور ماں ارباب ہمم کے اس اقدام پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی خدمت میں اتنا گزارش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے سامنے نصب العین بہت بلند رکھا ہے جس تک پہنچنے کے لئے پیہم کوشش اور مسلسل سعی و عمل کے ساتھ بلند ذہنی اور

قلبی صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر ان میں سے کسی چیز کی بھی کمی رہ گئی تو تہذیب الاخلاق کا نام بدنام ہو جائے گا۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

ISLAM OUR CHOICE (۵)

ہم پیدائشی مسلمان بہت کم جانتے ہیں کہ دیگر مذاہب عالم کے مقابلہ میں اسلام کی افضلیت اور مختلف نظام ہائے زندگی میں اس کی برتری اور انفرادیت کے دلائل و وجوہات کیا ہیں۔ ہم میں سے جنہیں دیگر اہل مذاہب کے ساتھ بحث کی ضرورت پڑتی ہے وہ تو اس موضوع پر کچھ دلائل اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور وہ بھی اس دائرہ کے اندر جس میں بحث گردش کرتی ہو لیکن عام مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا احساس تک بھی نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی غیر مسلم اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرے تو اس کی یہ بات سننے کے قابل ہوگی کہ اس نے اسلام میں کیا خوبی دیکھی جو اسے اختیار کر لیا۔

احمدیہ جماعت کا دو لنگ مشن ایک عرصہ سے یورپ میں تبلیغ کا کام کر رہا ہے اور ان کی طرف سے وقتاً فوقتاً اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں کہ کتنے غیر مسلموں (بالعموم عیسائیوں) نے اسلام قبول کیا۔ زیر نظر کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اسلام کی وہ کونسی خوبیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اسے بالعموم خود ان نومسلموں کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

موضوع کی اہمیت کے متعلق دو آرا ہو نہیں سکتیں۔ اس قسم کی کتاب کا شائع ہونا بڑا ضروری تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جن توقعات کو لے کر ہم نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا وہ پوری نہ ہوئیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ یورپ کے ان متلاشیان حقیقت نے اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوگا اور پھر بتایا ہوگا کہ ان کے نزدیک وہ نوع انسان کی ان مشکلات کا کیا حل بتاتا ہے جن سے اقوام عالم اس وقت دوچار ہیں۔ اور یہ دین کس طرح وہ راستہ دکھاتا ہے جس کی تلاش میں انسانیت مارے مارے پھر رہی ہے لیکن ہمیں اس قسم کی کوئی بات بھی ان لوگوں کے بیانات میں نہ مل سکی۔ ان میں بیشتر وہ ہیں جو عیسائیت کے عقائد مثل تثلیث۔ ابنیت و الوہیت مسیح۔ کفارہ وغیرہ کو وجہ تسلی نہ پاتے ہوئے اس مذہب سے بیزار تھے۔ اور یہی ان کے قبول اسلام کی بنیادی وجہ تھی۔ ان لوگوں کے دل میں اسلام کے متعلق اعتراضات کس قسم کے پیدا ہوتے تھے اور ان کے کس قسم کے جوابات سے وہ مطمئن ہو جاتے تھے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ان کا آخری اعتراض یہ تھا کہ اسلام میں جو دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھی جاتی ہے وہ ایک عادت سی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا فائدہ کیا ہے۔

انھیں اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ایک موسیقار، ہر روز گھنٹہ آدھا گھنٹہ کے لئے موسیقی کا ریاض کرتا ہے۔ وہ نہ اس سے کبھی تنگ پڑتا ہے۔ نہ اسے بے فائدہ سمجھتا ہے۔ اس کا اسے ضرور فائدہ ہوتا ہے — خواہ وہ ایسا سوچ سمجھ کر کرے یا ویسے ہی عادۃً۔ اس جواب سے وہ صاحب مطمئن ہو گئے۔ اور آخر الامر اسلام لے آئے

(صفحہ ۱۸۷)

کتاب کے دوسرے حصوں میں نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ، اسلام کا تعارف، اسلام اور نبی اکرمؐ کے متعلق غیر مسلموں کی شہادات، اور آیات قرآنی اور ارشادات نبویؐ کے انتخابات دیئے گئے ہیں۔ یہ حصہ زیادہ مفید ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔ شاید بغرض تبلیغ شائع کی گئی ہے۔

اسلام پر کیا گذری

ہر شخص کو اعتراف ہے کہ جو اسلام اس وقت ہم میں رائج ہے وہ اُس اسلام سے مختلف ہے جسے نبی کریمؐ نے پیش کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ حقیقی اسلام بعد والے اسلام میں کس طرح بدل گیا؟ ہمارے مروجہ (غیر اسلامی خیالات اور نظریات کہاں سے آ گئے۔ مصر کے نامور مورخ

علامہ احمد امین مرحوم

نے اس موضوع پر بڑی تحقیق کی ہے اور اسے اپنے تاریخی سلسلے میں مسلسل پیش کیا ہے۔ ان کی تاریخ کا پہلا حصہ

فجر الاسلام

(اردو میں) اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ

ضحی الاسلام

(اردو میں) شائع کیا گیا ہے۔ نادر معلومات۔ دلچسپ کوائف۔ علمی بحثیں۔ سادہ اور سلیس زبان

قیمت چار روپے (فجر الاسلام کی ضخامت دوگنی ہے، اس لئے اس کی قیمت آٹھ روپے ہے) جلد فرمائش بھیجئے۔ دونوں کتابیں منگانے پر محصول ڈاک معاف۔

منگانے کا پتہ:۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ایک کمیونسٹ نوجوان سے

اگلے دنوں ایک نوجوان طالب علم ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ایک کمیونسٹ اکثر اس قسم کے خیالات پھیلاتا رہتا ہے کہ "خدا کا تصور ایک افیون ہے جسے سرمایہ دار طبقے نے اس لئے وضع کر رکھا ہے کہ غریبوں کو اسی فریب میں رکھا جائے کہ غریبی اور امیری خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے تونگر بنا دے۔ جسے چاہے محتاج کر دے۔ اس میں کسی کا کچھ اختیار نہیں۔ اس سے سرمایہ داروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں کا خیال کبھی اس طرف آنے ہی نہ پائے کہ ان کی محتاجی اور غریبی کا موجب سرمایہ دار طبقہ ہے۔ اور وہ اس طرح مطمئن ہو کر غریبوں کا خون چوستے رہیں" اس نوجوان نے کہا کہ اس قسم کے خیالات عام طور پر طالب علموں میں پھیلائے جاتے ہیں اور چونکہ انھیں مذہب کے متعلق کچھ معلومات نہیں ہوتیں، اور سطحی طور پر کمیونسٹوں کے یہ دلائل جی کو لگنے والے ہوتے ہیں اس لئے یہ زہر سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔

طلوعِ اسلام ہم اس کے جواب میں کمیونسٹ نوجوان کو براہ راست مخاطب کرتے ہیں۔

ہمارے عزیز! یہ خیال کہ مذہب (یا خدا کا تصور) ایک افیون ہے جس سے غریبوں کو غریبی کے نشے میں مست رکھا جاتا ہے، مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ مقصد اس سے وہی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے یعنی اس سے غریبوں کو اس فریب میں رکھا جاتا ہے کہ تمہاری یہ حالت (اور امیروں کی امیری) خدا کی طرف سے ہے۔ نہ وہ اپنی امارت کی حالت کو غریبی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نہ تم اپنی غریبی کو امیری میں بدل سکتے ہو۔ تم مجبور ہو، اس لئے تم اپنی حالت پر شاکر و صابر رہو یعنی اس تصور میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ اس سے انسان کو مجبور بنا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود مارکسزم کی رو سے اس ضمن میں پوزیشن کیا ہے یعنی مارکسزم کے فلسفہ کی رو سے انسان مجبور ہے یا صاحب اختیار و ارادہ! مارکسزم کے فلسفہ

کی بنیاد مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) پر ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ جو بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنی انتہا تک جا پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نکلتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس سے وہ پہلا نظام مکمل ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظام لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک بڑی ان دیکھی قوت کے زور پر ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ پہلے غلامی کا دور تھا۔ پھر جاگیرداری کا نظام آیا۔ اس کے بعد کارخانہ داری شروع ہوئی۔ یہ سب نظام سرمایہ داری کے مختلف پہلو تھے۔ اب اسی جدلیت کے مطابق نظام سرمایہ داری کے خاتمہ کا وقت آپہنچا ہے۔ اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہوگا۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے جس کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکتا۔ ساری دنیا کے سرمایہ دار مل کر کوشش کر کے دیکھ لیں۔ تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے سامنے ان کی کوئی پیش نہیں جا سکے گی۔

یہ ہے مارکسزم کا فلسفہ۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا اس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور قرار پاتا ہے یا صاحبِ اختیار و ارادہ ٹھہرتا ہے؟ دنیا میں دو چار ہزار سال سے نظام سرمایہ داری قائم تھا۔ یہ نظام قائم تھا تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر جس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں ساری دنیا کے سارے غریب مل کر بھی چاہتے کہ اس نظام کو الٹ دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ تاریخی وجوب ان کے دانت توڑ کر رکھ دیتی۔ لہٰذا غریب اور کمزور اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اُس وقت نظام سرمایہ داری کے الٹنے کی خواہش یا کوشش کرتے تو کوئی مارکس خود اُٹھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ان سے کہتا کہ تمہاری کیوں عقل ماری گئی ہے جو تاریخی وجوب سے ٹکر لینے کی ٹھان رہے ہو! تم اسے الٹ نہیں سکتے۔ جب تک تاریخی وجوب موجودہ دور ختم ہونے کے بعد خود ہی اسے الٹ نہ دے۔ تمہیں اس حالت میں زندگی بسر کرنا ہوگی۔ تم اس باب میں مجبور ہو۔ تمہاری اس تباہی کا ذمہ دار سرمایہ دار طبقہ نہیں۔ وہ بیچارے تو خود تاریخی وجوب کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ نہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے سرمایہ دار ہیں۔ نہ تم اپنے اختیار و ارادہ سے غریب اور مزدور ہو۔ حتیٰ کہ اگر وہ چاہیں کہ تم پر رحم کھا کر تمہاری حالت کو بدل دیں تو وہ ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ کوشش تاریخی وجوب کے تقاضے کے خلاف ہوگی، جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

فرمایئے عزیزم! جس اعتراض کی بنا پر آپ خدا کے تصور کو افیون قرار دیتے ہیں کیا مارکسزم کا فلسفہ بعینہٖ وہی نتائج نہیں پیدا کرتا؟ اس صورت میں کیا مارکسزم کا فلسفہ بھی افیون نہیں جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تم تاریخی

وجوب کے ہاتھوں مجبور رہو، اس لئے تم اپنی حالت کے بدلنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ۔

اس فلسفہ کی رُو سے جو اور نتائج مرتب ہوتے ہیں ذرا انھیں بھی ذہن میں رکھیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رو سے نظام سرمایہ داری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کی ضد، دوسرا نظام قائم ہو گا۔ اگر سرمایہ دار طبقہ کہے کہ تم غلط کہتے ہو کہ اس نظام کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس کا ابھی دَور کچھ عرصہ تک اور رہے گا۔ تو آپ کے پاس ان کے اس دعوے کی تردید کی کیا دلیل ہے؟ آپ کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رو سے پہلے نظام کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ نہیں — اس سے بھی آگے بڑھئے۔ آپ کے پاس خود تاریخی وجوب کے وجود کا ثبوت کیا ہے؟ کیا آپ اس پر محض اس لئے ایمان نہیں لا رہے کہ مارکس نے ایسا کہہ دیا ہے؟ کیا آپ اسے عقیدۃً نہیں مان رہے؟ اگر صورت یہی ہے تو پھر حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے جس کا خدا (معاذ اللہ) تاریخی وجوب ہے۔ جس کا پیغمبر (پناہ بخدا) مارکس ہے اور جس کا کلمہ مادی جدلیت ہے؟ اور جس میں انسان بیچارہ اس "نئے خدا" (تاریخی وجوب) کے ہاتھ میں مجبور و مقہور رہے۔

دوسرے یہ کہ جب تاریخی وجوب کا یہ فیصلہ ہے کہ اب نظامِ سرمایہ داری ختم ہو جائے گا اور اسکی جگہ مزدوروں کا نظام مسلط ہو جائیگا تو آپ اس جدید نظام کے قیام کیلئے اسقدر ہاتھ پاؤں کیوں مار رہے ہیں، آپ مزدوروں سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ آپس میں متحد ہو کر نظام کہنہ کی بساط الٹ دو۔ آپ کیوں ہر جگہ فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں؟ آپ کیوں ایٹم بم کی دہشت سے نظام سرمایہ داری کو تباہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ کیا تاریخی وجوب میں اس کی قوت نہیں کہ وہ از خود اس فرسودہ نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ اشتراکیت کا نظام قائم کر دے؟ اگر یہ انقلاب آ کر رہتا ہے اور ساری دنیا کی متحدہ قوت بھی اسے روک نہیں سکتی تو آپ اس قدر مضطرب و بیقرار کیوں ہیں؟

اس کے بعد یہ سوچئے کہ آپ نظامِ سرمایہ داری کو انسانیت کے لئے زہر قاتل قرار دے کر اس کی ہزار برائیاں بیان کرتے ہیں۔ (یہ سب ٹھیک ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ نظام بھی تاریخی وجوب ہی کا قائم کردہ تھا تو پھر آپ اس پر اعتراض کس طرح کر سکتے ہیں؟ اور اس کے بعد اس پر بھی غور کیجئے کہ جب اشتراکی نظام کا دور ختم ہو جانے کے بعد جدلیت کے اٹل چکر کی بنا پر، پھر (اس نظام کی ضد) نظام سرمایہ داری کا زمانہ آجائیگا تو کیا اُس وقت آپ اشتراکی نظام کی خرابیاں بیان کر کے، لوگوں کو نظام سرمایہ داری قائم کرنے کی تلقین کرینگے؟ لیکن، اس تلقین سے ہو گا کیا؟ جن مزدوروں کے ہاتھ میں آپ آج زمامِ اقتدار دے رہے ہیں، یہ بیچارے پھر حسب سابق محکوم و محتاج ہو جائیں گے اور سابقہ سرمایہ دار پھر برسرِ اقتدار آجائیں گے۔

یہ ہے مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ! حقیقت یہ ہے کہ (اگرچہ یہ بات بظاہر کتنی ہی متضاد کیوں نہ دکھائی دے لیکن بادنیٰ تعمق انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ) نہ مارکس کوئی انقلابی ذہن رکھتا تھا۔ نہ اس کا فلسفہ

انقلاب کا پیامبر تھا یہ اسی قسم کا رجعت پسندانہ (RE-ACTIONARY) فلسفہ تھا جس قسم کے (غلط) فلسفے رجعت پسند طبقہ کی طرف سے اس سے پیشتر پیش ہوتے رہے۔ ایک وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ بادشاہوں کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) حاصل ہیں، اس لئے دوسرے انسانوں پر ان کی اطاعت لازم ہے۔ یہ فلسفہ بھی "افیون" تھا۔ کیونکہ عام انسانوں کو اطاعت پر مجبور قرار دیتا تھا۔ دوسرے وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ دنیا میں انسان کا مقام اس کے سابقہ جنم کے اعمال کی رو سے متعین ہوتا ہے۔ جو شودر کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنے سابقہ جنم کے بُرے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لئے اُس وزن میں جاتا ہے۔ جو برہمن کے ہاں جنم لیتا ہے، وہ اپنے سابقہ کرموں کا پھل پاتا ہے۔ ان میں سے نہ کسی نے یہ پوزیشن اپنے لئے خود متعین کی ہوتی ہے، اور نہ ہی اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ اس پوزیشن کو بدل سکے۔ شودر کا فریضہ ہے کہ وہ برہمن کی خدمت کرے اور برہمن کا حق ہے کہ وہ اس سے خدمت لے۔ اسی طرح غریبی اور امیری، رنج اور راحت، خوشحالی اور بدحالی، صحت اور بیماری کو بھی لیکھ اور ریکھ (قسمت کی لکیر) سے وابستہ کرکے انسان کو اپنی حالت پر مطمئن رہنے کی تلقین کر دی جاتی تاکہ اُس کا خیال ان گوشوں کی طرف آنے ہی نہ پائے جو اس کی ان تباہیوں اور بربادیوں کے ذمہ دار ہیں یہ کچھ سابقہ رجعت پسندوں نے کیا۔ اور اسی قسم کا فلسفہ مارکسزم نے پیش کر دیا کہ نظام ـــــ خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو ـــــ انسانوں کے ہاتھوں کا قائم کردہ نہیں، بلکہ تاریخی وجوب کا آوردہ ہوتا ہے۔ اس لئے انسان اس باب میں یکسر مجبور ہے۔ کہئے کہ اس فلسفہ میں اور سابقہ رجعت پسندوں کے فلسفہ میں کیا فرق ہے؟ اس وقت اسے آپ اس لئے موجب خیر و برکت قرار دے رہے ہیں کہ اتفاق سے تاریخی وجوب کی گردش سے سابقہ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو رہا ہے۔ لیکن کل کو جب دوسرے چکر کی باری آئے گی تو یہی فلسفہ مزدوروں اور غریبوں کے حق میں لعنت بن جائے گا اور انہیں اسی قسم کی افیون پلائے گا جس قسم کی افیون سابقہ رجعت پسندانہ فلسفے پلاتے تھے اور جسے چھڑانا آپ بہت بڑا جہاد قرار دے رہے ہیں۔

یہ تو رہا اس سوال کا منفیانہ گوشہ۔ اب آیئے اس کے مثبت پہلو کی طرف۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے پر نگاہ ڈالئے۔ وہ رجعت پسندانہ فلسفے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ساری دنیا پر مسلط تھے اور پورے شباب پر تھے۔ وراثتی ملوکیت اور بادشاہوں کے خداوندی اختیارات کا نظریہ۔ پیدائش کی رُو سے انسانوں کی ابدی تقسیم کا نظریہ۔ انسانوں کے اولین "ماں باپ" کے گناہوں کی پاداش میں ہر انسانی بچہ کا اپنی پشت پر گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہونے کا عقیدہ۔ خوش حالی اور بدحالی کو مقدرات کے ستاروں سے وابستہ کر دینے کا عقیدہ۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو یکسر مجبور اور بے بس قرار دینے کا ہر نظریہ، انسانی فکر و نظر پر پوری طرح مسلط تھا ـــــ اور

اگر مارکسزم کے تاریخی وجوب کے فلسفہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ دَور وہ تھا جس میں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط تھا جسے مارکس کے نظریہ کی رُو سے کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

اُس زمانہ اور ان حالات میں ایک شخص (علیہ التحیۃ والسلام) اٹھتا ہے اور ساری دنیا سے للکار کر کہتا ہے کہ تمہارے یہ تمام نظریات باطل اور مفاد پرستانہ ذہنیت کے پیدا کردہ ہیں۔ تمہارا صاحبِ قوت و دولت طبقہ (گروہ مترفین) غاصبانہ نظام قائم کرتا ہے، اور عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے "خدا" کی طرف منسوب کر دیتا ہے (یا آج کی اصطلاح میں اُسے تاریخی وجوب کہہ کر) عوام سے کہہ دیتا ہے کہ تم اسے بدلنے پر قادر ہی نہیں) وہ غاصبانہ نظام کے حاملین سے کہتا ہے کہ یہ سب تمہاری سازش ہے، تم غریبوں اور ناداروں کو خود ہی کچل کر رکھ دیتے ہو اور پھر ان کے متعلق کہتے ہو کہ اُن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ پیدا ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ بلند صلاحیت والے طبقہ کے خدمت گار اور اطاعت گزار رہیں۔ تم ان کے بچوں کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتے ہو اور زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے ان پر مسدود کر دیتے ہو، اور پھر یہ مشہور کرتے رہتے ہو کہ جاہل اور ذلیل رہنا ان کی تقدیر میں تھا۔ تم رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہو اور محتاجوں اور ناداروں سے یہ وعظ کہتے رہتے ہو کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ تمہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا! اُس (ذاتِ اقدس و اعظم) نے (ان مترفین سے یہ کہا اور غریبوں اور ناداروں کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے فریب میں نہ آجانا۔ یہ مستبدانہ اور غاصبانہ نظام ان لوگوں کا خود قائم کردہ ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے حسبِ ضرورت کھلے رہنے چاہئیں۔ خدا اپنی فطری بخشائشوں کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیتا کہ ایک طبقے کو آگے جانے دے اور دوسرے کے لئے راستہ روک دے۔ یہ جہانِ سعی و عمل ہے۔ یہاں قدر و قیمت محنت کی ہے پیدائشی نسبتوں کی نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جس قسم کا کام چاہے کرے۔ مفاد پرست گروہ اگر غلط نظام قائم کرتا ہے تو تم اس نظام کو الٹ سکتے ہو۔ یہاں کوئی تاریخی وجوب ایسا نہیں جو تمہیں اس نظام کو الٹنے سے باز رکھ سکے۔ اگر تم اپنی موجودہ پستی اور ذلت پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہو گے تو تمہاری حالت اور بھی پست اور ذلیل ہوتی جائے گی۔ اگر تم ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہو گے تو رزق اور اقتدار کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں آجائیں گی۔ لیکن دیکھنا! تم نے اُس وقت پھر غلط نظام قائم نہ کر دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تمہارے صحیح نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج اور محکوم نہیں ہو گا اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی باعزت طور پر پوری ہوتی رہیں گی اور ہر فرد کا احترام بہ حیثیت انسان ہونے کے برقرار رہے گا۔ نہ کسی کے

پاس دولت کے انبار جمع ہوں گے اور نہ ہی دولت صرف اوپر کے طبقے میں گردش کرتی رہے گی۔ اس نظام کو اپنے حلقے تک ہی محدود نہ رکھنا۔ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا کیونکہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں، اس لئے اس باب میں اپنے اور بیگانے کا فرق کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ہم پوچھتے ہیں اپنے اس کمیونسٹ نوجوان سے کہ کیا یہ تصور غریبوں اور کمزوروں کے لئے افیون ہے یا افیون زدہ انسان کو ہوش میں لانے کا تریاق ہے؟

اس کے بعد ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ مارکسزم کے مادی فلسفے کی رُو سے انسان اپنے ماحول (بلکہ معاشی نظام) کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس قسم کا ماحول (یا نظام) انہی خیالات کا حامل انسان ـــ انسان اپنے ماحول سے آگے نکل نہیں سکتا۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا یہ تصورات (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) اُس ماحول (بلکہ اُس زمانہ) کی پیداوار ہو سکتے ہیں جس میں یہ پیش کئے گئے تھے؟ کیا اُس زمانے میں کسی انسان کے حیطۂ خیال میں بھی یہ باتیں آ سکتی تھیں؟ کیا آپ تاریخ کی کوئی شہادت پیش کر سکتے ہیں کہ اُس زمانے میں کسی اور نے بھی اس قسم کے نظریات اور نظام کا تصور دیا ہو؟ جب اِس (عظیم شخصیت) سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے ان تصورات کا سرچشمہ کیا ہے تو اس (صلعم) نے کہا کہ یہ میرے اپنے خیالات نہیں۔ مجھے ان کا علم خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے؟ ہم آپ سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں، آپ کے پاس وہ کونسی دلیل ہے جس کی رو سے آپ یہ کہنے کی جراءت کریں کہ اُس (بلند بالا شخصیت) کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) صحیح نہیں تھا۔ آپ کس بنا پر ایسا کہہ سکتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ آپ ماورائے طبیعات (SUPRA-PHYSICAL) کسی شے کو نہیں مانتے۔ اول تو یہ دیکھئے کہ یہ کونسی دلیل ہے کہ جس چیز کو آپ نہ مانتے ہوں اس کا وجود ہی نہ ہو؟ دوسرے یہ کہ جس چیز کو آپ تاریخی وجوب کہتے ہیں وہ کونسی طبیعاتی چیز (PHYSICAL-THING) ہے؟ وہ بھی طبیعات سے بالا کوئی شے ہے۔ اور اسے آپ اس قدر صاحبِ قوت مانتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص کہدے کہ وہ خدا کا قانون ہے جسے اس قسم کی قوت حاصل ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض کیوں سمجھی جائے؟

اب دیکھئے کہ تاریخی وجوب اور خدائی قانون میں فرق کیا ہے۔ تاریخی وجوب ایک اندھی قوت ہے جسے اس سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں کہ انسانیت تباہ ہوتی ہے یا محفوظ رہتی ہے۔ اس نے صدیوں تک نظامِ سرمایہ داری قائم رکھا جس کے تاریخ مظلوم انسانیت بلکتی اور تڑپتی رہی لیکن اس نے اس نظام کو نہ خود ہی بدلا اور نہ ہی مزدوروں کو اس کی اجازت دی کہ وہ اسے بدل ڈالیں۔ اب اشتراکی نظام کی باری ہے۔ اس کے

بعد پھر سرمایہ دارانہ نظام کی باری آجائے گی۔ پھر انسانیت پیسے چلائیگی لیکن تاریخی وجوب ان کی ایک نہیں سنے گی۔ وہ ہزار کوشش کریں کہ اُس غاصبانہ نظام کو نہ آنے دیں، وہ آکر رہے گا۔

اس کے برعکس قانونِ خداوندی یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)، جو نظام تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہو، وہ باقی رہتا ہے یعنی انسانوں نے جب ایسا نظام قائم کر لیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع بخش ہو تو کوئی خارجی قوت ایسی نہیں جو اس نظام کو بدل کر اس کی جگہ غاصبانہ نظام لے آئے۔ حتیٰ کہ اگر غاصبانہ (یعنی تخریبی) نظام (جسے قرآن، باطل کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے) نافعانہ (یعنی تعمیری) نظام (جسے قرآن حق کہکر پکارتا ہے) کے مدمقابل آئے اور تعمیری نظام کے حاملین کی قوت اور تعداد مقابلتہً کم بھی ہو، تو بھی تعمیری نظام کامیاب رہے گا۔ اس لئے کہ خود کائنات کا رُخ تعمیر کی طرف ہے۔ تخریب کی سمت نہیں، اور آخرالامر تعمیری نظام ہی نے غالب آنا ہے، تخریبی نے نہیں۔ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ تخریبی نظام کے جس گوشے کی بساط ایک دفعہ الٹ گئی، پھر وہ دوبارہ نہیں بچھ سکی۔ کوئی ہزار کوشش کر کے دیکھ لے، غلامانہ اور جاگیردارانہ نظام اب دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ تاریخی وجوب کا نظریہ ——— جو درحقیقت یونانیوں کے اُس قدیم تصور کا چربہ ہے جس کی رو سے وہ سمجھتے تھے کہ کائنات کی حرکت دوری (CYCLIC) ہے ——— ایک باطل تصور ہے۔ زمانے کا دھارا کبھی پلٹ کر پیچھے نہیں گیا۔ نہ ہی جائے گا۔ کائنات کی حرکت دوری نہیں مستقیمی ہے۔ یعنی وہ ایک توازن بدوش راستے (صراطِ مستقیم) پر گامزن ہے اور اس طرح اس کا ہر قدم آگے کی طرف اٹھتا اور تعمیری منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ تاریخی وجوب کا نظریہ انسان کو مجبور قرار دیتا ہے اور تعمیری اور نافعانہ نظام سے گزرنے والی انسانیت کا مستقبل بھی تاریک بتاتا ہے کیونکہ اس کا ہر قدم تخریبی اور غاصبانہ نظام کی طرف اٹھتا ہے اور اس سے بچنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس قانونِ خداوندی انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ قرار دیتا ہے اور اس کا مستقبل روشن بتاتا ہے کیونکہ کائنات کا ہر قدم تعمیر کی طرف اٹھتا ہے اور اس کی منزل وہ ہے جس میں زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی (وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا)

کیا یہ کمیونسٹ نوجوان اس پر غور فرمائیں گے کہ جس خدا پر ایمان لانے کی دعوت قرآن کریم دیتا ہے وہ "افیون" ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مارکس کے سامنے خدا کا تصور ہی وہ تھا جو رجعت پسندانہ ذہنیتوں کا پیدا کردہ تھا۔ اگر اس کے سامنے قرآن کا پیش کردہ خدا کا تصور ہوتا تو اسے اس کے حضور جھکے بغیر چارہ ہی نہ ہوتا ——— اور اس طرح آج دنیا کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا۔

اِنسَانْ

پرویز

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

خدا کی تمام مخلوق میں جس کا علم اس وقت تک انسان کو ہو سکا ہے، انسان کی تخلیق، ایک بنیادی لحاظ سے، دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ حیاتیاتی طور پر (Biologically) دیکھئے تو انسان بھی، دیگر حیوانات کی طرح، ایک حیوان ہے۔ لیکن جہاں باقی حیوانات کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی زندگی، شروع سے آخر تک، ایک ہی سطح پر رہتی ہے، انسانی زندگی کی دو الگ الگ سطحیں ہیں۔ مثلاً گھوڑے کا بچہ جن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوگا، اس کی زندگی میں ان خصوصیات کی نشوونما تو ہوتی جائے گی، لیکن رہے گا وہ شروع سے آخر تک گھوڑا ہی۔ یعنی اس کی زندگی ایک ہی سطح پر رہے گی۔ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوگی۔ لیکن انسان کی کیفیت یہ نہیں۔ اس کی ایک سطح، حیوانی زندگی کی ہے، اور دوسری سطح اس سے یکسر مختلف ہے۔

جہاں تک اس کی حیوانی سطح زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچہ کی پیدائش بھی دیگر حیوانات کی طرح ہوتی ہے اور یہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے جن میں سے دیگر حیوانات گزرتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ابتداءً صفحۂ ارض پر غیر ذی حیات مادہ (Inorganic Matter) تھا۔ پھر اس میں، خدا نے زندگی کی نمود کی۔ وہ انسانی تخلیق کی داستان کی ابتدا، اسی مقام سے کرتا ہے جہاں کہتا ہے کہ

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔

زندگی کا سرچشمہ پانی ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا

اس لئے، انسانی تخلیق کا اگلا مرحلہ طین لازب (چپچپی مٹی) تھا۔ یعنی غیر ذی حیات مادہ (مٹی) اور سرچشمہ زندگی (پانی) کے امتزاج سے، زندگی (Life) کی ابتدا ہوئی۔

اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (۳۷/۱۱)

یقیناً ہم نے انہیں چپچپی مٹی سے پیدا کیا۔

اسی سے زندگی کا وہ جرثومہ اولیں (Life Cell) وجود میں آیا جسے قرآن نے نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کہہ کر پکارا ہے (۶/۹۸)۔ یعنی وہ خلیہ (Cell) جس کے اندر نر اور مادہ، دونوں کے امکانی اجزا موجود ہوتے ہیں۔

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ جَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا (۷/۱۸۹)

وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔

یہاں سے کاروانِ حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا، آگے بڑھتا گیا تا آنکہ وہ اس منزل میں جا پہنچا جہاں پیدائش بذریعہ تولید و تناسل ہوتی ہے۔ یعنی نر کے مادۂ تولید کا، مادہ کے رحم میں استقرار۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ (۳۵/۱۱)

اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔

اس منزل میں، ہر قسم کے حیوانات شامل ہیں۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ ۚ
وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰٓی اَرْبَعٍ ؕ
یَخْلُقُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (۲۴/۴۵)

اور اللہ نے ہر ایک ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہیں۔ اور وہ ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور وہ بھی جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ یہ سب خدا کے قانون مشیت کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر

کر رکھے ہیں جن پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس منزل میں، رحمِ مادر میں انسانی بچہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے جن میں سے دیگر حیوانات کے بچے گزرتے ہیں۔ سورۃ المومنون میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ پھر ہم نے اسے ایک نطفہ بنایا، جو رحمِ مادر میں، محفوظ جا پہنچا اور اپنی جگہ قائم کر لیتا ہے۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جونک جیسی شکل کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر اس لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑہ سا کر دیا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچہ پر گوشت کی تہ منڈھ دی۔ (۲۳/۱۲-۱۴) یہ وہ مراحل ہیں جن میں سے ہر حیوانی بچہ گزرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ پیدائش کے بعد بھی زندگی کے جتنے طبیعی مراحل (Physical Stages) ہیں ان میں بھی یہ سب برابر کے شریک ہوتے ہیں چنانچہ سورۃ حج میں ان تمام مراحل کا ذکر کرنے کے بعد جو اوپر بیان کئے گئے ہیں) فرمایا۔ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ پھر ہم تمہیں طفولیت کی حالت (ایک بچہ کی شکل میں)، رحم سے باہر لے آتے ہیں۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ۔ پھر تم اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ (۲۲/۵)۔ پھر تم میں کوئی ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے تک پہنچتا ہے ــــــ ان مراحل سے بھی تمام حیوانات یکساں طور پر گزرتے ہیں۔

یہ انسان کی طبیعی زندگی ہے جو انہی طبیعی قوانین (Physical Laws) کے تابع گزرتی ہے جن کے مطابق دیگر حیوانات جیتے اور مرتے ہیں ــــــ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، افزائشِ نسل کرنا، بیمار ہونا اور مر جانا ــــــ حتیٰ کہ جس چیز کو حیوانات کی جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے، اس سطح پر انسان کے بھی کم و بیش وہی جذبات ہوتے ہیں۔ حیوانات کے جبلی تقاضوں کی بنیادی طور پر ترتیب کی جائے تو وہ تین شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

(i) جذبۂ تحفظِ خویش ۔ (Self Preservation)

(ii) جذبۂ تغلب ۔ (Self Aggression)

اور (iii) جذبۂ افزائشِ نسل ۔ (Self Reproduction)

حیوانی سطحِ زندگی پر، انسان کے تمام کاروبار کے محرکات بھی یہی جذبات ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ دیگر حیوانات ان حدود کو نہیں توڑتے جو ان کے لئے فطرت نے مقرر کر دیئے ہیں، لیکن انسان حدود شکنی بھی کرتا ہے، اور اسی لئے اس کی طبیعی زندگی بھی بے حد تلخ اور سکون فراموش ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے انسان کے ان حیوانی جذبات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حٰم سجدہ میں ہے کہ انسان کی مستقل خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ

سے زیادہ مال و دولت ملتا چلا جائے۔ اس میں وہ کسی حد پر رکتا ہی نہیں۔ (لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ ۴۱/۴۹) اس کا یہ جذبہ بڑا ہی شدید ہے۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰/۸) یقیناً وہ مال و دولت کو اپنی طرف کھینچنے میں بڑا ہی شدت پسند واقع ہوا ہے۔ وہ دولت کی محبت کو اپنی ضروریات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں اس لئے وہ مرتے دم تک اس دیوانگی میں مبتلا رہتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ میں دنیا و مافیہا اور زندگی کے حقیقی مقصود سب سے غافل ہو جاتا ہے اور اس میں برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کسی مقام پر رکتا ہی نہیں حتیٰ کہ یہ قبر تک جا پہنچتا ہے۔ اسی جذبہ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ جسے ذرا سی مصیبت یا تنگی پیش آئے تو سخت مایوس ہو جاتا ہے وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (۴۱/۴۹) اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کے جذبۂ حصولِ مال و دولت کی کوئی انتہا نہیں وہاں اس کی مایوسی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس میں یہ خودکشی بھی کر لیتا ہے (حیوانات نہ اپنی ضرورت سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتے ہیں نہ ہی خودکشی کرتے ہیں) یہ بیحد بے صبرا واقع ہوا ہے اور اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹) اس کی حالت یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا مچا دیتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۰-۲۱) اور جب اسے مال و دولت حاصل ہوتا ہے تو اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ کسی کو نہیں دیتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۱۰۰/۶) یہ تنہا خور ہے اور اپنے نشوونما دینے والے کے سامانِ رزق میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ بیحد تنگ دل ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰)

ان سے کہو کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس میرے رب کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے، تو اس ڈر سے کہ وہ کہیں ختم نہ ہو جائیں تو تم انہیں روکے رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل واقع ہوا ہے۔

تنگ دل بھی اور ناشکر گزار بھی۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) اس کے ساتھ ہی اتنا جلد باز بھی کہ جذبات کی شدت میں بعض اوقات اپنے نفع نقصان میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱)

اور انسان بھلائی کو بلانے کی جگہ، برائی کو آوازیں دے کر بلا لیتا ہے۔ یہ ہے ہی بڑا جلد باز۔

اس شدت جذبات کا نتیجہ ہے کہ یہ بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی (Temptation) کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جھٹ پھسل جاتا ہے۔ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (۴/۲۸) انسان بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ بہت جلد جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) اور انسان اکثر جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اپنے طبیعی تقاضوں کی تشکیل میں اس کی یہی حد درجہ فراموشیاں ہیں جس کی وجہ سے یہ "ظالم اور جاہل" قرار پاتا ہے ــــ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا (۳۳/۷۲)

یہ تمام خصوصیات انسان کی حیوانی سطح زندگی کی ہیں۔ ذہنِ انسانی کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے ان جذبات کو انسانی فطرت (Human Nature) قرار دے دیا، حالانکہ انسانی سطح زندگی (Human Level) اس سے یکسر الگ اور ممتاز ہے۔ یاد رکھیئے! یہ انسان کے حیوانی جذبات ہیں۔ (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، انسان کی نہ کوئی "فطرت" ہو سکتی ہے۔ نہ "فطرت" ہے) ان حیوانی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے کہ ــــ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے۔ ایک فرد، دوسرے فرد کا دشمن اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے۔ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶)۔ اور اس کا نتیجہ

یُفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰)

خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں

حیوانی سطح زندگی پر اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ہو نہیں سکتا۔ زندگی "جنگل کے قانون" کے تابع رہتی ہے جس میں ہر طاقتور اپنے سے کمزور کا خون پیتا ہے اور ہر تیز پنجے والا، ضعیف کا گوشت نوچتا ہے۔ اس سطح پر انسان، انسان نہیں، بلکہ حیوان ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر ان سے بھی گیا گزرا۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ (۷/۱۷۹)

اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کی زندگی بس یہی حیوانی سطح کی زندگی ہے، تو قرآن کریم اس تصورِ حیات کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (۴۷/۱۲)

(اور جو لوگ کافر ہیں وہ سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ہیں)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

جہنم اس لئے کہ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت، ہر فرد (اور ہر قوم) اپنے طبیعی جذبات کی تسکین، اور حیوانی مطالبوں کے حصول کو منتہائے حیات سمجھتا ہے اور ان کے باہمی مفاد کے تصادم سے یہ دنیا جہنم میں بدل جاتی ہے۔

ان کے سامنے، اس سے بلند کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوتا ـــــ اور حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی زندگی کو بس یہی طبیعی زندگی سمجھ لیا جائے تو اس سے بلند مقصدِ حیات کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود و مقصود بنا لیا؟ جذبات کو معبود بنا لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم و عقل کے باوجود، علم و عقل سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اس کے جذبات اس کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی عقل و خرد پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و عقل کے باوجود وہ صحیح راستے پر نہیں آ سکتا۔ اس کی سننے، سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جب جذبات غالب آ جائیں تو عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ سو جب وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو صحیح راستے پر کیسے چل سکتے ہیں؟ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ سو قانونِ خداوندی کے علاوہ کوئی چیز صحیح راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ کیا یہ اتنی سی بات پر بھی غور نہیں کرتے؟۔

یہ کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی، بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں۔ اسی میں مر جائیں گے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، انسانی قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح انسان رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ سو جب زندگی انسانی جسم کی طبیعی مشینری کے چلتے رہنے تک ہے تو پھر انسان کے طبیعی تقاضوں کی تسکین کے علاوہ، مقصودِ حیات کیا ہو سکتا ہے؟

لیکن قرآن کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔ ان کا یہ خیال علم و حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔

آیئے اب دیکھیں کہ علم و حقیقت کی رُو سے بات کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی بچہ (جنین) بھی رحمِ مادر میں انہی طبیعی مراحل سے گزرتا ہے جس سے تمام حیوانی بچے گزرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن اس کے بعد قرآن نے ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے جو صرف انسان کو حاصل ہے اس میں دوسرے حیوان شریک نہیں۔ سورۂ سجدہ میں ان طبیعی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ۔

پھر خدا نے اسے سنوارا۔ اسے ٹھیک اعتدال پر لایا۔ اور اس میں اپنی "روح" پھونک دی۔ "روح" کے معنی توانائی (Energy) کے ہیں۔ اس کی ماہیت کیا ہے، اسے ہم نہیں جان سکتے۔ البتہ اس کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق قرآن کریم نے بتایا کہ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ۔ (۳۲/۹)۔ اس نے تمہارے لئے "سمع و بصر و فؤاد" بنایا۔ "سمع و بصر" سے عام مفہوم "ذرائع علم" ہے اور فؤاد کا تعلق احساسات (جذبات) سے ہے، لیکن قرآن کریم نے "سمع و بصر" کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی مراد انسان کا اختیار و ارادہ ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ہے۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ ہم نے انسان کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا جو مخلوط ممکنات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان ممکنات کی رفتہ رفتہ نمود ہوتی جاتی ہے تاآنکہ وہ "سننے دیکھنے والا" بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۲-۳) ہم اسے راستہ دکھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ چیز اس کے اختیار میں ہے کہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "روحِ خداوندی" (Divine Energy) جو بالخصوص انسان کو عطا ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہو گیا ہے۔ یہ خصوصیت نہ حیوانات کو حاصل ہے نہ کائناتی قوتوں کو۔ اسی خصوصیت کی بنا پر یہ مسجودِ ملائکہ قرار پایا ہے۔ سورۂ ص میں ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ۔ (۳۸/۷۱-۷۲)

جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی (غیر ذی حیات عنصر) سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اسے سنوار کر تکمیل تک پہنچا دوں، اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم نے اس کے سامنے اطاعت پذیری کے طور پر جھک جانا۔

آپ داستانِ آدم میں دیکھئے۔ ملائکہ کے متعلق تو کہا کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجا لاتے ہیں۔ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹-۵۰)۔ وہ اس سے کبھی سرتابی نہیں اختیار کرتے (یہ چیز صرف ملائکہ ہی کے متعلق نہیں کہی۔ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ۔ سب کے متعلق کہا ہے یعنی تمام کائناتی اشیاء اور ذی حیات کے متعلق)، لیکن جب آدم سے کہا گیا کہ "تم نے اس شجر کے قریب نہ جانا"، اس نے اس حکم کی نافرمانی کی یعنی آدم فرماں پذیری پر مجبور نہیں، یہ اس کے اختیار میں ہے کہ چاہے اطاعت اختیار کرے اور چاہے سرکشی برتے۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے

اس سے انکار کر دے۔ دیگر مخلوق مشیت کے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے لیکن انسان سے کہا گیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ "تم جو چاہو کرو"۔ تمہیں اس کی آزادی حاصل ہے۔ جیسا تم کرو گے اس کے مطابق تمہیں نتیجہ مل جائے گا۔

حیوانات کی مجبوری کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ کسی حیوان نے بننا ہوتا ہے وہ پہلے دن سے بن چکا ہوتا ہے (اس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے) لیکن انسان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ یہ بنا بنایا پیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ اس پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسے جو کچھ بننا ہے، خود بنے۔ خالقِ فطرت نے اس کی لوحِ تقدیر کو خالی رکھا ہے اور قلم اس کے اپنے ہاتھ میں دیدیا ہے کہ یہ اس لوح پر جو کچھ لکھنا چاہے خود لکھ لے۔ یہ وہی کچھ بن جائے گا جو کچھ یہ کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حیوانی سطح زندگی پر انسان کے جبلی تقاضے تو ہیں لیکن انسانی سطح پر اس کی کوئی فطرت (Nature) نہیں فطرت ان بنیادی خصوصیات (Characteristics) کو کہتے ہیں جو نہ کسی کی اپنی بنائی ہوئی ہوں اور نہ وہ ان کے بدلنے پر قادر ہو۔ فطرت اشیائے کائنات کی ہوتی ہے۔ حیوانات کی ہوتی ہے۔ انسان چونکہ مجبور نہیں اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں۔ اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہیں۔ کچھ ممکنات (Possibilities) ہیں۔ یہ ان صلاحیتوں کو جس انداز میں استعمال کرے گا وہی کچھ بن جائے گا۔ بلندی کی طرف جانا چاہے تو یہ اَحْسَنِ تَقْوِیْم (۹۵/۴) کا مظہر ہو گا پستی کی طرف جائے گا تو اَسْفَلَ السَّافِلِیْنَ[1] (۹۵/۵) کی سطح تک پہنچ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ "بلندی" اور "پستی" کیا ہے؟ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ زندگی جب حیوانی سطح سے اوپر ابھرتی ہے تو اس میں اختیار و ارادہ کی خصوصیت نمودار ہو جاتی ہے۔ لیکن اختیار و ارادہ نہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ نہ بجائے خویش مقصود بالذات ہے۔ جسے قرآن نے "روحِ خداوندی" کہہ کر پکارا ہے، اسے نفسِ انسانی (Human Personality) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اختیار و ارادہ درحقیقت نفسِ انسانی کی بنیادی خصوصیت ہے، اور مقصودِ حیاتِ نفسِ انسانی (انسانی ذات) کی نشوونما ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰)۔ جس نے اسے نشوونما دیدی وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسے دبا دیا وہ تباہ ہو گیا۔ جس طرح حیوانی زندگی کے تقاضے ہیں جن کے پورا کرنے سے انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی انسانی زندگی کے بھی تقاضے بھی ہیں جن کی تسکین سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس کی ذات کے تقاضے وہ ہیں جن میں حیوان شریک ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً تحفظِ خویش (Preservation of Self)

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔

کے سلسلے میں جسم کی پرورش، حیوانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ اس میں حیوان اور انسان (کی حیوانی سطح زندگی) دونوں برابر کے شریک ہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کی پرورش کا جذبہ بھی دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کی پرورش کا تقاضا حیوانات میں نہیں ہوتا۔ یہ انسانی سطح زندگی کا تقاضا ہے۔ ایک بیل مزے سے چارہ کھا رہا ہے۔ اگر اس کے پاس دوسرا بیل بندھا ہے جو چار روز کا بھوکا ہے، تو اس بیل کو اس کی بھوک کا خیال تک نہیں آئے گا۔ وہ اگر اس کے چارہ کی طرف منہ کرے گا تو یہ اسے مارنے کے لئے آگے بڑھے گا۔ اگر ایک انسان بھی دوسرے انسان کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے تو وہ حیوانی سطح زندگی پر ہے ——— بلکہ اس باب میں انسان، حیوان سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ بیل کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کا باقیماندہ چارہ کون کھا جاتا ہے لیکن انسان ہے کہ اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی فاضلہ سامانِ زیست کے پاس تک کسی کو بھٹکنے نہیں دیتا ——— لیکن اس کی انسانی سطح کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا نہ صرف خیال کرے بلکہ اس کا انتظام کرے۔ اس تقاضا کے پورا کرنے سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور انسانی ذات کا خاتمہ جسم کی موت کے ساتھ نہیں ہو ہو جاتا۔ یہ اس کے ساتھ ہی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اسی کو بلندی کی طرف جانا کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ انسان منزل بہ منزل، اوپر کو چڑھتا جائے گا۔ تو اس سے یہی مقصود ہے۔ اس کی حیوانی سطح زندگی کی انتہا تو یہ ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ۔ (۴۵/۱۳) یعنی اس طبیعی کائنات میں جو کچھ ہے اسے اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اشیائے فطرت اور کائناتی قوتوں کی تسخیر انسان کی حیوانی سطح زندگی کا منتہیٰ ہے۔ لیکن اس کی انسانی زندگی کے متعلق کہا کہ یہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے بھی آگے جا سکتا ہے (۵۵/۳۳)۔ یہی وہ مقام ہے جسے جنت اخروی کہا جاتا ہے لیکن جنت بھی اس کے ارتقائی سفر کا آخری مقام نہیں۔ وہ بھی اس کی رہگذر ہی ہے۔ اسے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ اس لئے کہ اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا۔ (۶۶/۸)۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں چلتا ہوگا اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے تو ہمارے نور کو تکمیل تک پہنچا دے اور ہر قسم کے خطرات سے ہماری حفاظت کر۔ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (۲۲/۲۴) ان کی راہ نمائی قابلِ تعریف راستے کی طرف کی جائے گی۔

جس معاشرہ میں حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کو مقصودِ حیات سمجھ لیا جائے اور انسانیت کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے، وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے لیکن جس معاشرہ میں حیوانی سطح کے تقاضوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ انسانیت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے، اور جب ان دونوں کا تصادم ہو تو انسانی تقاضوں کو ترجیح

دی جائے اسے اسلامی معاشرہ کہا جاتا ہے اور وہ نوعِ انسان کے لئے جنتی زندگی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اسی قسم کے معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔

اس معاشرہ میں ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ۱۷/۷۰) اس لئے کہ تکریم انسانیت اس "روحِ خداوندی" کی وجہ سے ہے جو انسان کی بنیادی خصوصیت ہے اور جو ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے۔ اس میں انسانی زندگی ——— خواہ وہ (عام معیاروں کے مطابق) ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کی بھی کیوں نہ ہو ——— بڑی گراں بہا تسلیم کی جاتی ہے اور ایک جان کی قیمت پوری نوعِ انسان کے برابر قرار دی جاتی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲)

جو کوئی کسی انسانی جان کو بغیر جان کے بدلے کے یا فساد فی الارض کے ناحق مار دے تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو مار دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو زندہ رکھا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔

اس معاشرہ کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان تفریقات کو مٹا کر جنہوں نے انسانوں کو الگ الگ گروہوں، پارٹیوں اور قوموں میں تقسیم کر کے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (۲/۲۱۳)۔ اس کا بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسی نظریۂ زندگی، اسی نظامِ حیات، اسی معاشرہ، اسی جماعت کو بقا اور حیاتِ جاوید مل سکتی ہے جس کے پیشِ نظر کسی خاص جماعت، گروہ، پارٹی، ملک یا قوم کا مفاد نہیں، بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

جو چیز تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو، اسے ہی زمین میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

وہ انسانوں کے بعض طبقوں کو پست اور کمزور رکھ کر، دوسرے طبقوں کو بلند اور طاقتور نہیں بنانا چاہتا۔ وہ پوری کی پوری انسانیت کو جسدِ واحد (ایک جسم یا ایک فرد) تصور کرتا ہے، کہ اگر کمزور ہے تو پورے کا پورا "فرد" کمزور ہے اور اگر طاقتور ہے تو پورے کا پورا طاقتور ہے۔ وَمَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۳۱/۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور اٹھانا، نفسِ واحدہ کی طرح ہے۔ اس کا مقصود و منتہیٰ ارتقائے انسانیت ہے، نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی ترقی اور باقیوں کی پستی۔ بعثت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو موانع کسی کے راستے

حائل ہوں انھیں دور کر دینا تاکہ وہ اپنی نقل و حرکت کے لئے آزاد ہو جائے۔ اس کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ قرآن کریم ان تمام موانع کو دور کر دینا چاہتا ہے جو نوعِ انسان کی ترقی کے راستے میں حائل ہوں ـــــ کسی ایک قوم یا ملک کی ترقی کے راستے میں نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ترقی کے راستے میں۔ نبی اکرمؐ کا مقدس مشن ہی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں نوعِ انسان جکڑے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ اور ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے انسانیت دب رہی تھی "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ"۔ (۷/۱۵۷)۔

یہ ہے وہ انسان جسے اکثر مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔ (۱۷/۷۰)۔

اور ہم نے انسانوں کو بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔

"بہت سی مخلوق" (اکثر مخلوق) اس لئے کہ مخلوق صرف اسی کرۂ ارضی پر ہی نہیں۔ کائنات میں نہ معلوم کہاں کہاں اور مخلوق ہے اور وہ کس قسم کی ہے۔ ارض کے علاوہ "سمٰوٰت" میں ذی حیات مخلوق کی شہادت تو خود قرآن کریم میں موجود ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ۔ (۴۲/۲۹)۔

اور اسکی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور سمٰوٰت میں ذی حیات مخلوق پھیلا رکھی ہے۔

اس مخلوق کا تو علم نہیں لیکن اس ارض پر مسجودِ ملائکہ "آدم" ہی ہے۔ یہاں انسان سے افضل کوئی مخلوق نہیں لیکن اسی انسان سے جو انسانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہو حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کو محض حیوانی یا طبیعی زندگی سمجھنا قرآن کریم کی رُو سے کفر ہے۔ اس لئے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی زندگی کو حیوانی سطح سے بلند انسانی سطح پر سمجھا جائے یعنی انسان کو محض آب و گِل کا طبیعی پیکر نہ سمجھا جائے جو جسم کے مادی عناصر کے انتشار (Disintegration.) سے ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان رکھا جائے کہ انسان طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور "شے" بھی رکھتا ہے جسے انسانی ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے یہ اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور ان کے نتائج کا حامل۔ اور اسی سے انسانی حیات کا سلسلہ موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس تصورِ زندگی سے انکار قرآن کی رُو سے کفر ہے۔

یعنی انسان کا خود اپنی ذات سے انکار کفر ہے۔

اسلام پر یونانی اور رومی تہذیب کے اثرات

علّامہ احمد امین مصری (مرحوم)

قارئین طلوع اسلام علّامہ احمد امین مصری سے ناواقف نہیں ان کے مایۂ ناز تاریخی سلسلہ میں سے پہلے فجر الاسلام کا ترجمہ، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ——— ضحی الاسلام کے پہلے حصّہ کا ترجمہ "اسلام پر کیا گزری" کے نام سے میزان پبلی کیشنز لمیٹیڈ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتابیں مُلک کے علمی طبقہ میں بالعموم اور حلقۂ طلوع اسلام میں بالخصوص مقبول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم فجر الاسلام کے ایک اور باب کا ترجمہ (بلا تبصرہ) شائع کرتے ہیں۔ اُمید ہے قارئین اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یونانی اور رومی تہذیب کس انداز سے اور کن راستوں سے اسلام پر اثر انداز ہوئی۔ (طلوع اسلام)

جب ہم یونان تک پہنچتے ہیں تو ہمارے ہاتھ ایک ایسے خزانے اور ایسی ثروت تک پہنچ جاتے ہیں جو نہ کبھی فنا ہوگا اور نہ اس سے کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم فلسفہ، ریاضیات، فلکیات علوم طبیعیہ، حیات، طب تاریخ، سیاست، فنونِ لطیفہ وغیرہ کے سلسلہ میں ایک ایسے بلند پایہ علمی ذخیرہ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جو انسانی عقل، انسانی رجحان اور ذوق ہی کا نتیجۂ فکر ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے ان تمام علوم میں اپنی رُوح پھونک دی ہے اور انسانی عقول کو اپنی افکار سے غذا مُہیّا کی، اور پوری دُنیا کو اپنی افکار، آداب، علوم اور اساطیر سے امداد بہم پہنچائی ہے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے مصوری، مجسّمہ سازی اور تصویر کشی سے ذوقِ انسانی کی تربیت بھی کی ہے۔

یونانی ثقافت کے پہلو

چنانچہ اقلیدس علم ہندسہ میں تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر اُنیسویں صدی تک امام بنا رہا۔ علمِ طب قدیم زمانہ سے لے کر قرونِ وسطیٰ تک اسی بُنیاد پر

قائم رہا جو بقراط اور جالینوس نے مدوّن کر دیا تھا۔ فلاسفہ آج تک سقراط، افلاطون اور ارسطو اور دیگر یونانی فلسفہ کے فائدہ عملی کے زلہ بار چلے آتے ہیں۔ افلاطون کی جمہوریت اور ارسطو کی سیاست آج تک جدید سے جدید نظریات سیاست کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ یہی حال ہر علم اور ہر فلسفہ اور ہر فن کی تمام شاخوں کا ہے مسلمانوں نے اپنے فلسفہ کی بنیاد یونانیوں کے فلسفہ پر ہی رکھی تھی۔ موجودہ تہذیب کی تمام علمی اور ادبی ترقیاں یونانیوں کی علمی اور ادبی کاوشوں ہی پر قائم ہیں۔ جدید یورپ کی علمی ترقی کا اوّلین شرارہ ان ہی کی کتابوں سے ابھرا۔ یونانیوں کے علوم اور ان کے فلسفہ کا امتیازی نشان جس پر فلسفہ کے تمام مورخین کا اتفاق ہے یہ ہے کہ یونان کے علماء تحقیقات کی تحقیق محض حقیقت کے لیے کرتے تھے جبکہ باقی دوسری قومیں اس لیے فلسفی بنتی تھیں کہ فلسفی بننے سے انھیں کچھ مادی فوائد حاصل ہوتے تھے یا انھیں اپنے دینی عقائد و معاملات کی تائید کے لیے فلسفہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسی وجہ سے فلسفہ کے مورخین نے ہندی، مصری، چینی، اشوری اور بابلی آراء و افکار کو فلسفہ شمار نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک فلسفہ کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ حقیقت مجردہ کی تحقیق و تفتیش کے لیے پوری آزادی کے ساتھ مادی رجحانات سے بلند ہو کر کوشش کی جائے اور نہ ہی ان مورخین نے رومی علماء مثلاً مارکوس اوریلیوس، سنیکا اور سسرو جیسے محققین کو فلاسفہ میں شمار کیا ہے کیونکہ انھوں نے دنیا کے سامنے جدید فلسفہ کی ایسی آراء پیش نہیں کیں جو یونانی فلسفہ کی ثروت میں کسی اضافہ کے باعث بنتیں۔

یہاں ہمارا مقصد یہ بیان کرنا نہیں کہ عالم فلسفہ اور فن کی ہر ہر شاخ میں یونانی علماء کی تحقیقات کہاں تک پہنچی ہوئی تھیں کیونکہ کسی کتاب کی ایک فصل اس بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی (اس سلسلہ میں آپ Legacy of Greece کا مطالعہ فرمایئے) ہمارا مقصد محض اس بات کو بیان کرنا کہ مسلمانوں نے یونانی اور رومی تہذیب سے کیا کچھ حاصل کیا اور مختصراً اس کی تحقیق کرنا ہے کہ یہ تہذیب مسلمانوں تک کس راستے پہنچی تھی۔

مشرق میں یونانی ثقافت کا پھیلاؤ

اسکندر مقدونی نے چونکہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو فتح کر لیا تھا اس لیے اس کی یہ فتوحات مشرق میں یونانی تہذیب کے پھیل جانے کے ایک بڑا سبب تھیں۔ اس کی مملکت یورپ میں یونان اور مقدونیہ تک، افریقہ میں مصر اور لیبیا تک، ایشیا میں سوریا، فلسطین، عراق، ایران، ترکستان، افغانستان، بلوچستان اور ہندوستان کے بعض حصوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ ان مفتوحہ ممالک اور یورپ کے ممالک کو ایک دوسرے سے قریب تر لائے اور یورپین جنس کو ایشیا اور افریقہ کی اجناس کے ساتھ تہذیب و مدنیت میں ایک دوسرے

کے ساتھ مدغم کر دے اور حکومت اور تہذیب کا ایک مخلوط نظام قائم کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ یونانیوں کو اس امر کی ترغیب دیتا تھا کہ وُہ ان ممالک میں سکونت اختیار کریں اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ان شہروں کی تنظیم یونانی طرز پر کر دیں۔ وُہ اپنے ادیبوں، میر منشیوں اور حکماء کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وُہ اپنا علم و ادب ان ممالک میں پھیلائیں۔ اسکندر کی اس پالیسی اور دوسرے یونانی حکام و امراء کی وجہ سے مفتوحہ مشرقی ممالک میں اسکندر سے حکومت بطور ورثہ کے حاصل کی تھی یہ نتیجہ نکلا کہ یونانی تہذیب و مدنیت اسکندر کے زمانہ ہی سے ان ممالک میں پھیلنے لگی تھی۔ جو شہر دجلہ اور فرات کے درمیان آباد تھے ان پر تو یورپین تہذیب پوری طرح غالب آچکی تھی حتیٰ کہ مورخین کا بیان ہے کہ جب کراسوس (CRASSUS) کی موت کی خبر اورودیس (ORODES) ایرانی شہنشاہ کو پہنچی تو وُہ یوریپیڈس (EURIPIDES) کی روایات کا تعزیتی خط لکھنے کے لیے مطالعہ کیا کرتا تھا۔

مُسلمانوں کی یونانی فلسفہ سے وابستگی

یہ تہذیب برابر ترقی کرتی اور اپنے نتائج مُرتّب کرتی رہی تا آنکہ جب یونانی فوجیں ان علاقوں سے نکل گئیں تب بھی مشرق میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد تک بھی بہت سے شہر یونانی تہذیب کے مراکز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ جن میں سے سب زیادہ مشہور چند لیسابور، حرّان اور اسکندریہ تھے۔

جندیسابور کا مدرسہ

چنانچہ جندیسابور خوزستان کا ایک شہر تھا جسکی بنیاد سابور اوّل نے رکھی تھی اور یہ شہر اس کی طرف منسوب تھا۔ سابور نے اسی شہر میں روم کے قیدیوں کو بسایا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ شہر آگے چل کر یونانی تہذیب کا سرچشمہ بن گیا تھا۔ کسریٰ نوشیرواں نے اس شہر میں طب کے مشہور مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جس میں تمام یونانی علوم کی تعلیم آرامی زبان میں دی جاتی تھی۔ اس شہر کو دیگر ایرانی شہروں کے ساتھ مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ اور یہ مدرسہ عباسی عہد تک قائم تھا۔ یاقوت حموی کے زمانہ میں اس شہر کے صرف ٹیلے اور کھنڈرات ہی باقی رہ گئے تھے اور آج ان کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ اس شہر کی جائے وقوع پر آج شہر "شاہ آباد" کے کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ [1]

کسریٰ نے جندیسابور میں ایک ہسپتال بھی قائم کیا تھا جس میں بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا اور طب اور متعلقاتِ طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خفطی کا بیان ہے کہ یہ شہر قسطنطنیہ کی صورت پر بنایا گیا تھا اور سب سے پہلے جن لوگوں

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں جندیسابور کا مادہ دیکھئے۔

نے اس شہر میں علم طب کی تعلیم دی تھی وُہ روم کے مشہور اطباء تھے۔ جب ان لوگوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی تو یہاں کے نوجوان باشندوں کو انھوں نے طب کی تعلیم دینی شروع کی۔ علم میں ان کو مساعی برابر آگے بڑھتی رہیں اور برابر اضافہ ہوتا رہا۔ انھوں نے یہاں کے شہروں کے مزاج کے مطابق علاج کے قوانین مرتب کئے حتیٰ کہ علوم و فضائل میں وہ برابر آگے نکلتے چلے گئے [1]۔

کسریٰ کی تخت نشینی کے بیسویں سال جندیسا بور کے اطباء شاہی حکم کے ماتحت اکٹھے ہوئے اور ان کے درمیان مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ ان کے سوالات و جوابات قلم بند کر لیے گئے تھے۔ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے ـــــ ان مسائل اور تعریفات پر جب کوئی پڑھنے والا غور کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ جندیسا بور کے اطباء اور علماء کا علم و فضل کس بلند درجہ تک پہنچا ہوا تھا [2]۔ جندیسا بور کے اطباء کا اعتقاد تھا کہ وہی اس علم کے اہل ہیں اور انھیں یہ علم اپنے شہر اور اپنی اولاد اور اپنی جنس سے باہر نہیں جانے دینا چاہیئے۔ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حارث بن کلاہ ثقفی؛ طبیب عرب نے اسلام سے پہلے جندیسا بور کے مدرسہ ہی میں علم طب حاصل کیا تھا اور وُہ ایران میں کافی عرصہ تک مطب کرتا رہا تھا۔ حارث بن کلاہ نے ایران کے کسی بڑے رئیس کا علاج کیا جس نے اسے بہت مال و دولت اور ایک باندی انعام میں عطا کی۔ حارث نے اس باندی کا نام سُمیّہ رکھا تھا، یہ سُمیّہ ہی زیاد بن ابیہ کی ماں تھی۔ حارث ابتداء اسلام ہی میں مر گیا تھا اور اس کا اسلام لانا ثابت نہیں ہوتا [3]۔

جندیسا بور کے مدرسہ میں یونانی تہذیب کے پہلو بہ پہلو ہندی تہذیب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی بعض ہندو مدرس تعلیم و تدریس کی خدمت مامور تھے جو پہلوی زبان میں نوجوانوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

جندیسا بور کا مدرسہ زمانۂ اسلام میں بھی بالکل اسی طرح کام کرتا رہا جیسا کہ ایرانیوں کے عہد حکومت میں کام کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس مدرسہ کی وابستگی عباسی عہد خلافت میں زیادہ بڑھ گئی تھی کہتے ہیں کہ ابوجعفر منصور نے جب بغداد کا شہر آباد کیا تو اس کے معدہ میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی جس کا علاج اس کے اطباء نہیں کر سکے۔ لوگوں نے جورجیس ابن بختیشوع کا نام لیا جو جندیسابور کے اطباء میں سب زیادہ سربرآوردہ طبیب ہوتا تھا [4]۔ اور اسی وقت سے خلفاء کے محلات میں جندیسابور کے مدرسہ سے وابستگی بڑھتی گئی حتیٰ کہ ہارون رشید نے جبریل بن بختیشوع طبیب کو اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ وہ بغداد میں اسی طرز کا ایک ہسپتال تعمیر کرائے جیسا کہ جندیسا بور میں تھا۔ اس ہسپتال کی باگ ڈور جندیسابور کے اطباء اور ان کے شاگردوں ہی کے ہاتھوں میں رہی [5]

---

[1] اخبار الحکماء ص ۱۳۲ - [2] ایضاً ص ۱۳۳ - [3] ایضاً ص ۱۱۱ و ما بعد - [4] اخبار الحکماء ص ۱۶۱ - [5] قفطی ص ۸

عباسی عہد خلافت میں جندیسا بور کے مدرسے سے جورجیس بن بختیشوع ــــ منصور کا طبیب ــــ اور اس کا بیٹا بختیشوع ــــ ہارون رشید کا طبیب ــــ اور جبریل بن بختیشوع ــــ مامون رشید کا طبیب ــــ بہت مشہور طبیب گزرے ہیں۔ یہ سب کے سب نصرانی تھے اور نسطوری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حرّان کا مدرسہ رہ گیا حرّان تو یہ جزیرہ عرب کا ایک شہر ہے جو عراق کے شمال میں واقع تھا اور رُہا (اڈیسا) اور راس العین کے درمیان واقع تھا۔ یہ بہت پرانا شہر تھا اور یونانیوں، رومانیوں اور نصرانیت و اسلام کے ہم رہ چکا تھا۔ اسکندر کے عہد میں بہت سے مقدونی عراق کے اس شمالی حصے میں آباد ہو گئے تھے۔ اس کا یہ اثر تھا کہ حرّان میں جن دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی ان کے نام زیادہ تر یونانی تھے ــــ نصرانیت کے ابتدائی زمانہ میں عراق کے شمالی حصے ہیں ــــ جن میں سے حرّان بھی ایک شہر تھا ــــ یہاں کے اصلی باشندے یعنی سریانی لوگوں کے ساتھ ساتھ اکثر مقدونی، یورپین، رومن اور عرب بھی سکونت پذیر تھے۔ جب نصرانیت نے زور پکڑا اور رومن ایمپائر کا سرکاری مذہب قرار پا گیا تو انھوں نے حرانیوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ نصرانیت اختیار کر لیں مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسا کے ذمہ دار لوگ حرّان کو بُت پرستوں کا شہر ہیلینوپولیس (HELLENOPOLIS) کہا کرتے تھے۔ حرّان (جو بُت پرستوں کا شہر بن گیا تھا) کی طرف یونان وغیرہ کے وہ لوگ بھاگ کر آتے تھے جو نصرانیت میں داخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مذہب دینِ بابلی، دینِ یونانی قدیم اور افلاطونیت جدیدہ کا معجون مرکب تھا۔ چنانچہ زمانہ اسلام میں مامون رشید کے عہد تک ان کی یہی حالت رہی حتیٰ کہ مامون رشید کے زمانہ میں ــــ ان لوگوں نے اپنا نام صابئہ رکھ چھوڑا تاکہ انھیں قرآن کریم کے اس مفہوم کی حمایت حاصل ہو سکے جس سے صابئہ کا اہلِ کتاب میں سے ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ صابئہ کا نام ان لوگوں پر اس سے پہلے نہیں بولا جاتا تھا بلکہ ان لوگوں پر بولا جاتا تھا جس کا دین درحقیقت یہودیت اور نصرانیت کا آمیزہ تھا۔ وہ لوگ بطیحہ کے مقام پر ــــ جیسا کہ قفطی نے بیان کیا ہے ــــ جو واسط اور بصرہ کے درمیان ایک وسیع علاقہ ہے، سکونت پذیر تھے۔

ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ مامون اپنے آخری زمانہ میں بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لیے مضر کی آبادیوں پر گزرا جہاں اسے کچھ لوگ ملے جو اس کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ ان میں حرانیوں (حرنانیوں) کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ان کا فیشن یہ تھا کہ لمبی لمبی قبائیں پہنتے تھے اور لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ . . . . . . مامون کو ان کا فیشن اوپرا سا معلوم ہوا اور ان سے پوچھا کہ تم ذمی لوگوں میں سے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ ہم حرانی (حرنانی) ہیں۔ مامون نے پوچھا کیا تم نصرانی ہو؟ انھوں نے بتایا کہ نہیں۔ مامون نے کہا تو پھر یہودی ہو؟ انھوں نے کہا کہ

نہیں۔ مامون نے کہا کہ کیا تم مجوسی ہو؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ مامون نے کہا کہ کیا تمھارے پاس کوئی خدا کی کتاب ہے اور تم میں کوئی نبی گذرا ہے؟ تو وہ بات کا جواب نہیں دے سکے اس پر مامون نے کہا کہ پھر تو تم زندیق ہو اور بت پرست ہو۔ تم وہی لوگ ہو جو میرے والد ہارون رشید کے زمانہ میں اصحاب الراس کے نام سے متعارف تھے تمھارے خون حلال ہیں اور تم سے ہمارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہم ذمی ہیں اور جزیہ ادا کرتے ہیں۔ مگر مامون نے کہا کہ جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جا سکتا ہے جو اسلام کے خلاف کسی ایسے دین سے تعلق رکھتے ہوں جس کا تذکرہ خدائے عزوجل نے اپنی کتاب میں فرمایا ہو اور ان کے پاس کوئی کتاب ہو۔ لہٰذا تمھیں دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یا تم دین اسلام کو قبول کر لو یا کسی ایسے دین کو قبول کر لو جس کا تذکرہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے ورنہ میں تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا اور ایک متنفس کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا[1] میں تمھیں اپنے اس سفر سے واپس آنے تک کی مہلت دیتا ہوں ــــ مامون یہ حکم صادر کر کے چلا گیا اور بلاد روم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے لباس کی ہیئت کو بدل دیا۔ بال منڈا دیئے اور قبائیں پہننی چھوڑ دیں۔ ان میں سے بہت سے آدمی نصرانی بن گئے اور انھوں نے زنار پہننے شروع کر دیئے۔ ان میں سے کچھ مسلمان بھی ہو گئے اور تھوڑے سے لوگ اپنے پرانے مذہب پر باقی رہ گئے۔ یہ بے چارے اپنی نجات کی تدبیریں سوچنے اور ادھر ادھر مارے مارے پھرنے میں مصروف تھے حتیٰ کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے حران کا ایک بوڑھا فقیہ بلا یا گیا۔ اس بوڑھے فقیہ نے بتایا کہ میں نے ایک ایسی صورت نکال لی ہے جس سے تم بچ جاؤ گے اور قتل ہونے سے محفوظ رہو گے۔ ان لوگوں نے اس بوڑھے فقیہ کو بہت سامال و متاع دیا اور اس نے انھیں بتایا کہ جب مامون رشید اپنے سفر سے واپس آئے تو تم اس سے کہنا کہ ہم صابی ہیں یہ ایک ایسے دین کا نام ہے جس کا تذکرہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں کیا ہے۔ تم اس نام کو اختیار کر لو۔ اس طرح تم بچ جاؤ گے۔ تقدیر کا کرنا کہ مامون رشید کا اس سفر میں انتقال ہو گیا اور وہ واپس نہیں آ سکا مگر ان لوگوں نے اس وقت سے صابی مذہب کا نام اختیار کر لیا کیونکہ حران اور اس کے نواحی میں ایسی کوئی قوم آباد نہیں تھی جو اپنے آپ کو صابیہ کہتے ہوں ــ جب ان لوگوں کو مامون رشید کے مر جانے کی اطلاع ملی تو ان میں سے جو لوگ نصرانی بن گئے تھے وہ بھی مرتد ہو گئے اور انھوں نے پھر اپنے بال بڑھا لئے آخر[2] اس وقت سے ان لوگوں کو صابئہ کہا جانے لگا۔

بہر حال یہ حرانی علماء اسلامی عہد میں یونانی تہذیب و ثقافت کا ایک بڑا سر چشمہ تھے۔ جندیسابور کا مدرسہ

حـ۱ یہ مامون الرشید کا فیصلہ تھا۔ قرآن کریم کا نہیں (طلوع اسلام) حـ۲ الفہرست صفحہ ۳۲

جب خلفاء عباسیہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا تو اس کے بعد حرانی علماء نے بھی عباسی خلفا کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی ان میں سے سب سے پہلے ثابت بن قرہ (۲۲۱ — ۲۸۸ھ) نے وابستگی اختیار کی خلیفہ عباسی معتضد تک انہیں بنو موسیٰ ابن شاکر نے پہنچایا تھا جو مامون رشید کے پروردہ تھے۔ اس وقت سے حرانیوں کو خلفاء عباسیہ کا اور پھر سلاطین بنو بویہ کا قرب برابر حاصل رہا۔ ان میں سے ثابت بن قرہ کو جو ایک طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ریاضی اور فلکیات کے ماہر بھی تھے اور ابن سنان طبیب کو جو فضائی مظاہر کے بڑے عالم تھے اور مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے پوتے ابراہیم بن سنان کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی اس طرح بنو ہلال کے خاندان کو جس میں سے ہلال ابن ابراہیم ایک مشہور طبیب تھے۔ بلاغت کے علاوہ انھیں ریاضی، ہندسہ الاہیئت میں بھی بڑا ید طولیٰ حاصل تھا، بڑی شہرت کے مالک ہوئے نیز انہی حرانیوں میں سے علامہ بتانی بھی تھے جو کواکب کے متعلق تحقیقات اور علم ہندسہ کی مہارت میں بڑے مشہور رہتے تھے۔ ان کی ایک زیچ بھی ہے جو ان کی نسبت سے بہت مشہور رہی ہے اور ابو جعفر خازن ریاضی اور ابن وحشیہ بھی تھے جن کی طرف "خلافت بنطیہ" کو منسوب کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر جندیسابور کے مدرسہ کے اثرات نے یونانی ثقافت و تہذیب اور فلسفہ کو پھیلانے میں بڑا کام کیا تھا تو ریاضیات اور خصوصیت کے ساتھ علم ہیئت کو پھیلانے میں حران کے مدرسہ نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا تھا اور چونکہ ان کے مذہب میں کواکب کی تعظیم کی جاتی تھی اور کواکب کے ناموں پر ہیکل قائم کرنے کا رواج تھا اسی لیے غالباً یہ لوگ علوم ریاضی اور فلکیات میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔

اسکندریہ کا مدرسہ رہ گیا اسکندریہ تو وہ یونانی استعمار کے زمانہ میں مصر کا دارالحکومت تھا جہاں سب سے بڑے فلسفیانہ مذہب یعنی مذہب اسکندرانین یا افلاطونیت جدیدہ نے جنم لیا تھا۔ اس مذہب کا بانی خود ایک مصری شخص افلوطین (۲۰۵ - ۲۶۹ م) تھا یہ مذہب اپنے اہم ترین افکار میں فلاسفہ یونان کا متبع تھا چنانچہ اس مذہب کے ابتدائی عناصر اور اجزاء، افلاطون، ارسطو اور رواقیین کی آراء سے ماخوذ تھے[1]۔ افلاطین اپنی روحانیت اور مادی مذہب پر تنقید کرنے میں امتیازی درجہ کا مالک تھا حتیٰ کہ خود افلوطین نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی روحانیت میں استغراق در روحانیت کے درجے تک، جسے تصوف کی اصطلاح میں فناء فی اللاہوتیت بھی کہا جاتا ہے، اپنی زندگی میں بارہا پہنچ چکا ہے۔ اس مقام تک اس کا شاگرد فورفوریوس

---

[1] اس مذہب کے متعلق فجر الاسلام ص۱۵۳ اور مابعد پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے ص۱۵۴ اور مابعد پر سریانیین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی دیکھ لیجئے۔

(PHORPHYRY) بھی پہنچ چکا تھا۔ افلوطین کا یہی مذہب مملکت روما میں ایک نمایاں فلسفیانہ مذہب کی حیثیت سے ـــــ اپنے بانی کی وفات کے بعد ـــــ اڑھائی سو سال کے عرصہ تک چھایا رہا۔ تاآنکہ شہنشاہ جوستنیان کا زمانہ آیا اور اس نے ۵۲۹ء میں اثینیا کے فلسفہ کے تمام مدارس کو بند کرنے اور فلاسفہ کی املاک ضبط کر لینے کا حکم صادر کیا۔ اس نے ان کی عقلوں پر قفل ڈال دالدیئے اور زبانوں کو بند کر دیا۔

اس فلسفیانہ تحریک کے پہلو بہ پہلو ادب، علم اور فن میں بھی وسیع تحریک پروان چڑھ رہی تھی اور اسکندریہ کا مدرسہ ان تمام تحریکات کی تائید کرتا تھا۔ یہ مدرسہ ۳۰۶ء ق م سے لے کر ۶۴۲ء ب م تک قائم رہا۔ اسکندریہ کا مشہور کتب خانہ اور لائبریری ان تمام تحریکات کو غذا بہم پہنچاتی تھی۔

اس مدرسہ کے مؤرخین مدرسہ کی تاریخ کو دو حصوں پر تقسیم کرتے ہیں پہلا حصہ بطالسہ کی حکومت کے قیام سے لے کر رومیوں کے غلبہ تک (یعنی ۳۰۶ء ق م سے لے کر ۳۰ء تک) تھا۔ اس عہد میں اسکندریہ ادب اور لٹریچر میں دنیا کے تمام شہروں میں سب سے آگے شمار ہوتا تھا۔

اور دوسرا حصہ ۳۰ء سے لے کر ۶۴۲ء تک تھا۔ ۶۴۲ء وہ سال ہے جب کہ عربوں نے اسکندریہ کو فتح کر لیا تھا۔ اس عہد میں اسکندریہ اس فلسفی مذہب میں امتیازی شان کا مالک تھا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہ مدرسہ اپنی عمر کے دونوں حصوں تک اردگرد کی دنیا کے ساتھ کامل ارتباط رکھتا تھا اور چاروں طرف اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔

رومیوں کے دور حکومت میں نصرانی مذہب بھی اسکندریہ میں اس طرح پھیل چکا تھا جیسا کہ دوسرے شہروں میں پھیل رہا تھا۔ اسکندریہ میں نصرانی مذہب یونانی فلسفہ کے پہلو بہ پہلو کھڑا تھا۔ نصاریٰ آپس میں دست و گریبان اور مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ حضرت مسیح کی طبیعت، اس کی ناسوتیت، لاہوتیت اور خدا کے ساتھ حضرت مسیح کے تعلق جیسے مسائل میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ فلسفہ کے پاس چونکہ منطق اور مناظرانہ ترتیب اور ماوراء مادہ سے متعلق قیمتی ابحاث تھیں اس لیے نصرانیوں کو فلسفہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف جھکنا پڑا۔ یہیں سے نصرانیت نے یونانی فلسفہ کا چولا پہنا۔ یا یہی ربط و اتصال کی یہ پہلی تحریک اسکندریہ ہی میں شروع ہوئی جیسا کہ اس سے پہلے فلسفہ کے ساتھ یہودیت کا ربط و اتصال بھی فیلون کے ہاتھوں اسکندریہ ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس سلسلہ میں نصاریٰ کے سربرآوردہ اور پیشرو لوگوں میں سے کلیمان اسکندری (CLEMENT)[1] زیادہ مشہور ہیں جنہوں نے نصرانیت کو افلاطونیت

---

[1] کلیمان کی پیدائش ۱۵۰ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ ان کے والدین اثینا میں بت پرست تھے۔

کے ساتھ آمیز کیا۔ پھر ان کے بعد اوریجن (ORIGEN) (۱۸۵ء تا ۲۵۴ء) آیا جو افلاطین کا شاگرد تھا۔ اوریجن کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور بالآخر وہ اسکندریہ سے بھاگ گیا اور اس نے اسکندریہ کے مدرسہ کے انداز پر فلسطین میں قیصریہ کے مقام پر ایک دوسرا مدرسہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسی انداز پر ایک اور مدرسہ نصیبین کے مقام پر قائم ہوا مگر یہ مدرسہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا اور رہا کی طرف منتقل کر لیا گیا ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکندریہ کا وہ انداز کہ نصرانیت کو فلسفہ کے ساتھ آمیز کر دیا جائے مشرق کے تمام گوشوں میں پھیل گیا اور اکثر علماء کلیسا نصرانیت کو فلسفیانہ انداز سے یا فلسفہ کو نصرانیت کے انداز سے پڑھانے لگے اور ان کی زیادہ تر قوتیں دونوں کے متعارض اصول و عقائد میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر صرف ہونے لگیں۔ مثلاً نصاریٰ نے کہا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ باپ ہونا بیٹا ہونے پر مقدم ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک سبب اپنے مسبَّب پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مسیح سے پہلے ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف فلسفہ کو دیکھئے۔ وہ کہتا ہے کہ علت اولیٰ یا بالفاظ دیگر اللہ کو کسی قسم کا کوئی تغیر لاحق نہیں ہو سکتا۔ تو وہ باپ کیسے بن سکتا ہے جب کہ اس سے پہلے وہ باپ نہیں تھا۔ لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ "بیٹے" کی کوئی ایسی تفسیر کی جائے جو فلسفہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

اس فلسفیانہ چہل پہل کو قائم کرنے میں نسطوری فرقہ کے نصاریٰ زیادہ سرگرم تھے۔ انھوں نے اپنے مدرسے اور اپنی تعلیمات پورے مشرق میں پھیلا دی تھیں۔ یہ لوگ سریانی زبان میں تعلیم دیتے اور یونانی کتابوں کو سریانی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ ایشیا میں ان دنوں ایران اور روما کے درمیان جنگ برپا تھی۔ چنانچہ بہت سے شہر ایسے تھے جن پر کبھی رومیوں کا قبضہ ہو جاتا تھا اور کبھی ایرانیوں کے ہاتھوں پڑ جاتے تھے۔ نسطوری فرقہ کے پیشوا "برسونا" نے شہنشاہ ایران فیروز کو اس بات کا اطمینان دلا دیا تھا کہ نسطوری فرقہ کے لوگ رومیوں کو پسند نہیں کرتے کیونکہ انھیں رومیوں سے بڑی اذیتیں پہنچی ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ ایرانیوں کے ہوا خواہ رہنا چاہتے ہیں چنانچہ فیروز نے برسونا کی اس بات پر اعتماد کر لیا اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ نسطوری فرقہ کے لوگوں نے وعدہ کیا تھا وہ آخر وقت تک اس پر قائم رہے۔[1]

غالباً اس واقعہ سے ان بے شمار پیچیدہ سوالات پر روشنی پڑ جاتی ہے جو ایک محقق کو پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایرانیوں کا یونانی فلسفہ کے ساتھ کس طرح تعلق قائم ہوا؟ ایساغوجی اور اس جیسی دوسری کتابیں ان تک کیسے پہنچیں؟ مشرق میں پھیلے ہوئے یہ صومعے اور گرجے یونانی فلسفہ کا سرچشمہ کیسے بن گئے؟ یونانی فلسفہ کے ساتھ مسلمانوں کا ارتباط

---

(۱) ولیری کتاب ARABIC THAUGHT ملاحظہ فرمایئے۔

کیسے پیدا ہوا جس کا دینی مناقشات اور مذہبی مناظروں میں اکثر مظاہرہ ہوتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ معتزلہ وغیرہ کے مناقشات میں یہ رنگ ہمیں زیادہ نظر آتا ہے حالاں کہ مامون رشید کے عہد سے پہلے یونانی فلسفہ کو باضابطہ طور پر عربی میں منتقل نہیں کیا گیا تھا؟ ابتدائی مترجم۔ خواہ وہ یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرتے ہوں یا سریانی زبان سے —— زیادہ تر نصاریٰ یا بُت پرست کیوں ہوتے تھے؟ غالباً ان سوالات کا ایک حد تک جواب نسطوری فرقہ کے ان حالات سے مل جاتا ہے جو ہم نے اُوپر بیان کئے ہیں۔

اسکندرانی اور مصری کلیسا —— زیادہ تر —— یعقوبی مسلک کا پیرو تھا جن کی زبان سریانی اور قبطی تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایشیا میں فلسفہ کے متعلق سریانی زبان میں جس قدر نسطوری فرقہ کے لوگوں نے علمی ذخیرہ پیدا کیا وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا یعقوبی فرقہ کے لوگوں نے مصر میں پیدا کیا تھا۔ کیوں کہ ایشیا میں دینی مجادلات —— خصوصاً عراق میں، خود نصاریٰ کے باہمی فرقوں میں اور نصاریٰ کے دوسرے ادیان و مذاہب کے ساتھ —— مصر کی بہ نسبت کہیں زیادہ پیش آتے رہتے تھے۔ اسکندریہ کا اسکول طب، کیمیا، علوم طبیعیہ میں زیادہ شہرت رکھتا تھا اور اس کی یہ حالت عربی فتوحات تک قائم تھی لیکن اس زمانہ میں ان کی بحثیں زیادہ تر سحر، طلسمات، نجوم وغیرہ سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ مصر میں یعقوبی فرقہ کے علماء پر افلاطونیت جدیدہ کا غلبہ تھا وہ تصوف کی طرف زیادہ مائل تھے۔ انھیں صومعوں اور گرجاؤں میں رہ کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنا زیادہ پسند تھا۔ جب کہ ایشیا میں نسطوری فرقہ کے لوگوں کا رجحان فلسفیانہ تفکر کی طرف زیادہ تھا اور انھیں منطقی اسلوب زیادہ پسند تھا۔ صومعے اور گرجے ان کے ہاں بھی ہوتے تھے مگر انھیں رہبانیت یا روحانیت میں اتنا استغراق نہیں تھا۔

اس عہد میں ترجمہ کی تحریک

اموی عہد حکومت میں مسلمانوں کا ارتباط اسکندریہ کے سکولوں کے ساتھ قائم ہوا چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خالد بن یزید بن معاویہ کے لیے بعض کتابوں کا ترجمہ اصطفن نے کیا تھا جس کا پورا لقب قفطی نے "اصطفن اسکندرانی" بتایا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ابن ابجر —— جو اسکندریہ کا ایک طبیب تھا —— عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی صحبت میں رہا تھا چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے اپنا طبیب بنا لیا تھا اور فن طب میں وہ اس پر بڑا اعتماد فرمایا کرتے تھے۔"[1]

عباسی عہد حکومت میں بھی ہمیں اسکندرانی اسکول کے چند شاگردوں کے نام نظر آتے ہیں مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے بیان کیا ہے کہ بلیطیانؔ ایک نصرانی طبیب تھا جو ملک مصر میں بہت مشہور تھا اور منصور کے عہد خلافت میں وہ

(۱) عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ۔

اسکندریہ کا بشپ تھا۔ جب ہارون رشید خلیفہ ہُوا اور اس کی ایک مصری باندی بیمار ہوگئی تو اس نے کسی مصری طبیب کو بلانا چاہا تاکہ وُہ اس کا بہتر طریقہ پر علاج کر سکے چنانچہ ہارون رشید کی خواہش پر اسی بلیطیان طبیب کو اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں سعید بن توفیل کا نام ملتا ہے جو احمد بن طولون کا طبیب تھا۔ نیز اور بھی کئی نام ملتے ہیں (۱)

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ اسکندریہ کے اسکول کو عباسی خلفاء کے ساتھ وُہ ارتباط حاصل نہیں ہو سکا جو جندیسابور اور حرّان کے اسکولوں کو حاصل تھا اور نہ ہی اسے وُہ اثر و رسوخ حاصل ہو سکا جو ان دونوں اسکولوں کو حاصل تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مصر عراق سے کافی دُور تھا اور حرّان اور جندیسابور اس سے قریب تھے۔ ساتھ ہی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسکندریہ کا اسکول —— جیسا کہ ہم پہلے اشارۃً کہہ چکے ہیں —— روحانی مجاہدات رہبانیت اور مکاشفات میں ڈوبا ہوا تھا جب کہ عراق کے اسکول اس کے برعکس دنیوی حالات سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور ان میں دنیوی علوم و فنون کا اہتمام بھی زیادہ تھا اور ظاہر ہے کہ عباسی حکومت جیسی نئی ابھرنے والی حکومت کے لیے اس قسم کے خیالات زیادہ مناسبت رکھتے تھے۔ اسکندریہ کے اسکول کا رجحان تو زیادہ تر تصوف کی طرف تھا آگے چل کر ہم تصوف سے گفتگو کریں گے تو اس موضوع پر بھی انشاء اللہ روشنی ڈالیں گے۔ ان کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہو سکتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ اسکندریہ کا اسکول اسلام سے بہت پہلے کافی کمزور ہو چکا تھا اس اسکول کے علمبرداروں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان کی کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں حتیٰ کہ اس اسکول کے بہت سے علماء کو یا تو نصرانی مذہب اختیار کرنا پڑا یا دوسرے شہروں کی طرف بھاگ جانا پڑا۔

بہر حال نسطوری فرقہ اور یعقوبی فرقہ کے لوگوں نے یونانی کتابوں کی شرحیں لکھیں اور انھوں نے ہی ان کتابوں کو یونانی زبان سے سریانی زبان میں منتقل کیا۔ جب عربوں کے ساتھ ان لوگوں کا ربط و ضبط بڑھا تو ابتداءً انہی لوگوں نے ان کتابوں کو سریانی زبان سے عربی زبان میں منتقل کیا اور ان پر شرحیں لکھیں۔ اس علمی حرکت کی تاریخ جو نسطوری اور یعقوبی فرقوں کے لوگوں کے ہاتھوں پروان چڑھی اس میں ہمیں دو عیب نظر آتے ہیں (اوّل) اختراعی مادہ کی کمی چنانچہ جو کچھ انھوں نے عربی زبان میں منتقل کیا وُہ محض نقل تھی۔ نہ اس پر کسی جدید تحقیق کا اضافہ کیا اور نہ ہی نئے نظریات قائم کئے بلکہ زیادہ تر ان لوگوں نے مختلف مسائل میں نئی آراء تک پیش نہیں کیں (دوم) یونانی علوم و فنون کو ان لوگوں نے نقل کرتے ہوئے باریک بینی کے ساتھ نقل بھی نہیں کیا۔ بہت سی چیزوں میں تبدیلیاں کر دیں اور بہت سی باتوں

(۱) عیون الانباء صفحہ ۸۶/۲

میں تحریف کر ڈالی۔ چنانچہ وُہ غلطیاں جو علمی طور پر عربوں سے سرزد ہوئیں ان کا زیادہ تر منشاء یہی سریانی غلطیاں تھیں سچی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں عربوں نے ان سے کہیں زیادہ ابتکار و اختراع اور وقت نظر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے چنانچہ مسلمانوں کے علوم و فنون کی جن لوگوں نے تاریخ لکھی ہے انھیں ان علوم فنون کے دو حصے کرنے پڑے ہیں جن تک مسلمانوں کی رسائی ہو چکی تھی ایک حصہ تو وُہ ہے جو اُنھوں نے یونان سے اخذ کیا اور دوسرا حصہ وُہ ہے جو انھوں نے خود ایجاد و اختراع کیا۔

اس عہد میں عربی زبان کی طرف ارسطو کی اہم تصانیف اور اسکندرانیوں کی شرحیں منتقل ہوئیں جو ارسطو کی کتابوں پر ان لوگوں نے لکھی تھیں۔ ساتھ ہی کچھ افلاطون کی تصنیفات اور فن طب سے متعلق جالینوس کی اہم ترین تصانیف بھی عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔ مختصر یہ ہے کہ علم و فلسفہ کی وُہ اہم ترین چیزیں جن تک یونانی عقل پہنچ سکتی تھی وُہ سب عربی زبان میں منتقل ہو چکی تھیں۔ یہاں ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم ان کتابوں کو الگ کر دیں جو ان لوگوں نے ترجمہ کی تھیں تاہم یہاں مجملاً یہ بتا دینا ممکن ہے کہ ترجمہ کے کام کو تین دَوروں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دَور: منصور کی خلافت سے شروع ہو کر ہارون رشید کے آخری عہد پر ختم ہوتا ہے یعنی ۱۳۶ھ سے ۱۹۳ھ تک اس دَور میں کلیلہ و دمنہ کا فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا اور سند ھند کا ہندی زبان سے ترجمہ ہُوا۔ منطق وغیرہ میں ارسطو طالیس کی کچھ کتابوں کا ترجمہ ہُوا نیز فلکیات پر مجسطی کی کتاب کا ترجمہ ہُوا۔ اس دَور کے سب سے مشہور مترجمین میں ابن المقفع تھے جن کے حالات پہلے گزر چکے ہیں۔ نیز جرجیس ابن جبرائیل اور یوحنا بن ماسویہ۔ آخر الذکر دونوں کے دونوں نصرانی طبیب تھے ——— اس دَور میں معتزلہ کا ارتباط ان ترجمہ شدہ کتابوں کے ساتھ قائم ہو چکا تھا چنانچہ معتزلہ کے پیشرو حضرات مثلاً نظام وغیرہ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارسطو سے واقف تھے اور اس کی بعض تصنیفات سے انھیں اچھی خاصی واقفیت تھی۔ ان کی علمی بحثیں کافی حد تک منطق سے اثر پذیر تھیں بلکہ وہ فلسفیانہ اصطلاحات مثلاً ظفرہ، جوہر اور عَرَض وغیرہ کے بارہ میں گفتگو کرتے تھے۔ اس کی وضاحت ہم چل کر کریں گے۔ مامون رشید کے عہد سے پہلے اس قسم کے مسائل پر معتزلہ کا گفتگو کرنا صاف طور پر بتاتا ہے کہ انھیں ترجمہ کے ابتدائی دَور ہی سے فلسفہ کے ساتھ لگاؤ ہو چکا تھا۔

دُوسرا دَور: مامون رشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی ۱۹۸ھ سے ۳۰۰ھ تک۔ اس دَور کے مشہور ترین مترجم یوحنا یحییٰ البطریق ——— مامون کے آزاد کردہ غلام ——— تھے۔ ان پر طب کی بہ نسبت فلسفہ کا زیادہ غلبہ تھا۔ انھوں نے ارسطو کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اور حجاج بن یوسف ابن مطر وثاق کوفی جو ۲۱۴ھ تک زندہ تھے۔ نیز قسطا بن لوقا بعلبکی جو ۲۲۰ھ تک زندہ تھے۔ اور عبدالمسیح بن ناعمہ حمصی جو ۲۲۰ھ تک زندہ تھے۔ نیز حنین ابن اسحٰق جن

کا انتقال ۲۶۰ھ میں ہوا۔ اور ان کے فرزند رشید اسحٰق بن حنین کا انتقال ۲۹۸ھ میں ہوا۔ اسحٰق بن حنین نے زیادہ تر فلسفہ کی کتابوں پر کام کیا جب کہ ان کے والد نے زیادہ تر طب کی کتابوں کی خدمت کی تھی۔ نیز ثابت بن قرہ جن کا انتقال ۲۸۸ھ میں ہوا، اور حبیش اعسم جو حنین کے بھانجے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مترجمین تھے۔ اس دور میں ہر فن کی اہم ترین یونانی کتابوں کا ترجمہ کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ مجسطی کی کتاب کا دوبارہ ترجمہ کیا گیا۔ فیثاغورس کی کتاب "الحکم الذہبیہ" کا ترجمہ کیا گیا اور بقراط اور جالینوس کی تمام تصنیفات کا ترجمہ ہوا۔ نیز افلاطون کی کتاب "طیماوس" اور افلاطون ہی کی کتاب "سیاست مدینہ" اور کتاب النوامیس کا ترجمہ ہوا۔ ساتھ ہی ارسطو کی کتاب المقالات کا بھی ترجمہ ہوا ان تمام کتابوں کا ترجمہ حنین ابن اسحٰق اور اس کے اسکول کے ہاتھوں سرانجام پایا جبکہ ارسطو کی زیادہ تر کتابوں کا ترجمہ اسحاق بن حنین کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔

تیسرا دور: مذکورہ بالا مترجمین کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مشہور ترین مترجم متّٰی ابن یونس (بغداد میں ۳۲۰ھ میں موجود تھے) اور سنان ابن ثابت بن قرہ (متوفی ۳۶۰ھ) اور یحییٰ بن عدی (متوفی ۳۶۴ھ) اور ابن زرعہ (متوفی ۳۹۸ھ) انھوں نے جن کتابوں کا ترجمہ کیا ان میں اہم ترین کتابیں ارسطو کی منطق اور طبیعیات سے متعلق تھیں جن کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا اور شرحیں بھی لکھیں۔(۱)

عباسی دورِ حکومت میں ترجمہ اور اس کی ترقی کا باعث چند امور تھے۔

تراجم کا باعث

(اوّل) اموری دورِ حکومت ـــــ ایک حد تک ــــ بدوی عہدِ حکومت تھا جس میں عربوں کی سیادت دوسری قوموں پر پوری طرح سے غالب تھی۔ عربوں میں اس عہد تک فلسفہ کی طرف میلان پیدا نہیں ہوا تھا انھیں عربی لٹریچر اور عربوں کے احوال و حوادث کی باتیں پسند آیا کرتی تھیں۔ ان کے خلفا کسی عربی قصیدہ کو غور سے سننے میں لذّت محسوس کرتے تھے۔ اور پیچیدہ الفاظ کی تحقیق اور اسی قسم کی باتیں ان کو مرغوب تھیں۔ جب عباسی دورِ حکومت آیا اور مسلمانوں پر تہذیب کا گہرا رنگ چڑھ گیا اور غیر عربی عناصر کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا۔ تو عربوں نے بھی محسوس کیا کہ تمدّنی زندگی کے لیے علم کا سہارا لینا انتہائی ضروری ہے حکومت کے مالیات کو دقیق حساب کی ضرورت تھی۔ مرکب مدنیت کی زندگی کے لیے

---

(۱) پروفیسر سانت لانا کا مجموعہ مضامین دیکھئے۔ اگر آپ ان کتابوں کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں جو اس دور میں ترجمہ ہوئیں۔ تو ابن ندیم کی الفہرست اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء اور قفطی کی اخبار الحکماء کا مطالعہ کیجئے۔ پروفیسر جورجی زیدان نے بھی اپنی کتاب ـــ "تمدّنِ اسلامی" میں مختصراً ان سب کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

مرکب دواؤں اور مرکب علاج کی ضرورت تھی۔ ایک یا دو قسم کے علوم کی جب انھیں ضرورت محسوس ہوئی اور دوسری قوموں سے انھوں نے ان ضروری علوم کو حاصل کرنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ ان کے علمی شغف نے ان دوسرے علوم کو جاننے کا شوق بھی پیدا کر دیا جو دوسری قوموں کے ہاں پائے جاتے تھے اور جن کی انھیں کوئی فوری ضرورت لاحق نہیں تھی۔

(دوم) دینی حرکت علمیہ دولت امویہ کے آخری عہد میں اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی ـــــ جس کا تذکرہ ہم فجر الاسلام میں کر چکے ہیں ـــــ بحث و تحقیق نے انھیں قضاء قدر جیسے مسائل پر بھی گفتگو میں کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے عقیدۂ جبر کو اختیار کر لیا اور دوسرے لوگوں نے عقیدۂ اختیار کو ترجیح دے ڈالی چنانچہ اولاً خود مسلمانوں میں باہم بحث و تمحیص شروع ہوئی اور پھر مسلمانوں، عیسائیوں، اور یہودیوں کے درمیان مناظرہ کا دروازہ کھل گیا کہ ان میں سے کون سا دین بہتر ہے اور اس قسم کے جزئی مسائل میں کون سے دین کی آراء زیادہ صحیح ہیں۔ اس عہد میں اسلام کی طرف سے مدافعت اور مخالفین سے مقابلہ کے لیے معتزلہ ہی سب سے پیش پیش تھے۔ یہودیت اور نصرانیت پہلے ہی سے یونانی منطق اور فلسفہ سے مسلح ہو چکی تھیں اور باہمی مناظرات میں وہ ان سے کام لیتی تھیں۔ لہٰذا مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے خود ان کے ہتھیاروں سے مسلح ہونا ضروری ہے چنانچہ مسلمان بھی منطق اور فلسفہ کی طرف رجوع کرنے لگے اور اپنی ضروریات میں ان سے کام لینے لگے۔ رفتہ رفتہ انھیں اس عقلی لذت کا چسکا سا پڑ گیا جو فلسفہ کے اسباق سے انھیں حاصل ہوتا گیا۔ ابتداءً فلسفہ کی طرف وہ اس لیے مائل ہوئے تھے کہ وہ مدافعت کا ایک ذریعہ ہے مگر آہستہ آہستہ وہ خود ایک مقصد بن گیا جو محض فلسفہ ہونے کی غرض سے حاصل کیا جانے لگا۔

(سوئم) تیسرا سبب جو پروفیسر نالینو نے بیان کیا ہے یہ بھی تھا کہ دولت امویہ کے آخری ایام میں اسلام کا تسلط ان تمام شہروں اور ملکوں پر مستحکم ہو چکا تھا جن میں اسلامی جھنڈے صلح یا فتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلسل جنگوں اور گوناگوں فتوحات کے دوران ان کا تسلط اور غلبہ ترکستان میں ماوراء النہر کی انتہائی حدود سے لے کر مغرب اور اندلس کے آخری کناروں تک پھیل گیا تھا۔ اور ان تمام ممالک و بلاد میں عربی زبان پھیلتی جا رہی اور وہاں کی اپنی تہذیبوں کو شکست دیتی جا رہی تھی۔ مسلمان عام طور سے کسی قوم یا کسی مذہب کے لوگوں سے کاروبار حکومت میں کام لینے سے احتراز تو نہیں کرتے تھے لیکن وہ عربی زبان ہی میں کام لیتے تھے۔ اس طرح وحدت دین کا نتیجہ وحدت زبان اور وحدت حضارت و عمران کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ بالآخر ایرانیوں، عراقیوں، شامیوں اور مصریوں نے اپنے قدیم ورثہ کی حفاظت اسی میں دیکھی کہ اپنے قدیم علوم کو اسلام کے جدید تمدن میں سمو دیں اور انھیں عربی زبان

میں منتقل کریں۔ (۱)

(چہارم) چوتھا سبب عباسی عہد میں چند فلسفیانہ علوم کی طرف کی ذاتی میلان بھی تھا۔ فطری طور پر خلفاء کو اس پر زیادہ قدرت تھی کہ جن چیزوں کو وہ خود پسند کرتے تھے لوگوں کو بھی ان کی طرف راغب کر سکتے تھے۔ تمام لوگ خلفاء کی خواہش کو پورا کرنے اور جن چیزوں کی طرف وہ گہرا میلان رکھتے ہوں ان کی طرف جھک جانے میں بڑی تیزی دکھایا کرتے تھے۔ عباسی دورِ حکومت میں فلسفہ کی طرف میلان رکھنے میں عباسی خلفاء میں سے منصور، ہارون اور مامون رشید سب سے آگے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے میلان کے کچھ خاص وجوہ و اسباب تھے جن کی بناء پر وہ فلسفیانہ علوم کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ منصور کو پرخوری اور اس کی وجہ سے ضعفِ ہضم کی شکایت تھی۔ بظاہر یہی وجہ تھی کہ وہ طب اور اطباء پر خاص طور سے مہربان تھا۔ تاریخ طبری میں علی بن محمد بن سلیمان نوفلی نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ منصور کو کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور وہ طبیبوں سے اس کی شکایت کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ جوارشیں بنا دیں۔ لیکن اطباء جوارشوں کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس سے کہتے تھے کہ آپ کم سے کم کھانا کھایا کیجئے۔ وہ بتاتے تھے کہ جوارشیں فوری طور پر تو کھانوں کو ہضم کر دیتی ہیں مگر وہ کوئی ایسی نئی بیماری پیدا کر سکتی ہیں جو اس کے لیے اس شکایت سے زیادہ سخت ہو سکتی ہے۔ بالآخر منصور کے پاس ہندوستان کے اطباء میں سے کوئی طبیب آیا۔ اس نے بھی وہی رائے دی جو دوسرے طبیبوں نے دی تھی۔ لیکن بالآخر اس نے منصور کے لیے ایک خاص چورن بنانا منظور کر لیا جو خشک سفوف کی شکل میں ہوتا تھا۔ اس میں ہاضم چیزیں اور چند گرم دوائیں شامل تھیں۔ منصور کھانا کھانے کے بعد اسے کھایا کرتا جس سے اس کا کھانا ہضم ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ منصور اس ہندوستانی طبیب کا بہت ہی مداح تھا (۲) اسی طرح اسے نجومیوں پر بھی بڑا اعتقاد تھا جس کا بیان آگے آتا ہے۔ چنانچہ وہ نجومیوں کو اپنے قریب رکھا کرتا تھا۔ ہارون رشید کو برامکہ کی تربیت نے خاص طور پر فلسفیانہ علوم کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ عباسی خاندان کے بہت سے لوگ بھی خلفاء کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے جیسے موسیٰ ابن شاکر وغیرہ۔

اس پوری تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد اب ہر اس رائے کی غلطی واضح ہو جائے گی جو یونانی کتابوں کے ترجمہ کے کام کو مامون رشید کے ایک خواب کی طرف منسوب کرتی ہے۔ ابن ندیم نے "الفہرست" میں نقل کیا ہے کہ علوم قدیمہ میں سے فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کے بکثرت ترجمہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مامون رشید نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک گورے رنگ کا آدمی جس کے رنگ میں سرخی جھلکتی تھی اور جس کی پیشانی کشادہ، بھویں پیوستہ بڑا سر، بڑی بڑی آنکھیں، خوبصورت و خوش سیرت مامون رشید کے تخت پر متمکن ہے۔ مامون رشید نے بیان کیا کہ صورت کچھ ایسی تھی کہ میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور مجھ پر اس کی ہیبت طاری تھی میں نے اس آدمی سے

پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ میں ارسطاطالیس ہوں۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا اے حکیم! میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا پوچھو! میں نے کہا "اچھی چیز کیا ہوتی ہے"؟ ارسطو نے کہا کہ "جو عقل کے نزدیک اچھی معلوم ہو" میں نے کہا کہ اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا کہ "اس کے بعد وہ چیز اچھی ہے جو شریعت کے نزدیک اچھی ہو"۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا کہ اس کے بعد وہ چیزیں جنھیں جمہور عوام اچھا کہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا کہ اس کے بعد کچھ نہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ مامون نے اس کے بعد کہا کہ مجھے کچھ اور بتائیے تو ارسطو نے کہا کہ یاد رکھو، جو آدمی تمہیں سونے (GOLD) کے بارہ میں کچھ نصیحت کرے اسے تمہارے خیالات میں سونے (GOLD) ہی کے لیے ہو جانا چاہیئے اور توحید کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا۔ چنانچہ یونانی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرانے کا سب سے بڑا سبب یہی خواب تھا (۱)

ابن ابی اصیبعہ نے اس واقعہ کو ایک دوسری صورت سے نقل کیا ہے کہ مامون نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک خوبصورت بوڑھا آدمی ایک منبر پر بیٹھا ہوا خطبہ دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں ارسطاطالیس ہوں۔ مامون خواب سے جاگا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ ارسطاطالیس کون تھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ یونان کا ایک بڑا حکیم آدمی تھا۔ چنانچہ مامون نے حنین بن اسحٰق کو بلوایا کیونکہ یونانی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے اسے اس سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ مامون نے حنین سے خواہش کی کہ یونانی حکماء کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کر دے اور مامون نے اس پر بیشمار دولت خرچ کی اور انعامات عطا کئے۔

ہمیں کہنا یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی دوسری کہانیاں ترجمہ کا سبب نہیں تھیں بلکہ ترجمہ کے کچھ اور فطری اسباب تھے اور وہ اسباب وہی تھے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ کی روایت تو حقیقت سے اور بھی بعید ہے۔ بڑی ہی ناممکن سی بات ہے کہ مامون نے اس خواب سے پہلے ارسطو کا نام نہ سنا ہو حتیٰ کہ ارسطو اس کے خواب میں آئے اور اسے بتائے کہ میں ارسطو ہوں۔ ابن الندیم کا بیان اگر صحیح ہو تو اس سے ہمیں اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی صورت کا انکاس ہی خواب میں بھی ہو گیا تھا کیونکہ بے داری کی حالت میں بھی مامون اکثر و بیشتر ان امور کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔

---

(۱) الفہرست ص ۲۴۳

آہستہ آہستہ موضوعات فلسفہ سے مسلمانوں کی وابستگی

صاعد اندلسی کی کتاب طبقات الامم میں مذکور ہے کہ ابتداء اسلام میں عرب کے لوگ صرف ان علوم پر توجہ کرتے تھے جو انکی زبان میں ہوتے تھے اور شرعی احکام کی معرفت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں صرف فن طب کا استثناء تھا جو عرب کے لوگوں کے ہاں پایا جاتا تھا اور عام عرب کے لوگوں کے لیے اجنبی یا معیوب نہیں تھا کیوں کہ اس کی سب ہی لوگوں کو ضرورت پڑتی تھی اور حضور اکرم صلعم کا وہ ارشاد بھی ان کے ہاں موجود تھا جس میں علم طب کی طرف ترغیب دلائی گئی تھی چنانچہ آپ نے فرمایا تھا "اے اللہ کے بندو! دوا کیا کرو۔ کیونکہ خدا نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں فرمائی جس کی دوا پیدا نہ کی ہو۔ بجز ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپے کی بیماری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اموی دور حکومت میں عربوں کا یہی حال تھا۔ جب خدا نے حکومت کو بنو امیہ سے ہاشمی خاندان میں منتقل کر دیا تو لوگوں کی ہمتیں خواب غفلت سے بیدار ہوئیں اور اذہان معقول علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے جس نے علوم کی طرف توجہ کی وہ دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور تھے۔ خدا ابو جعفر منصور پر رحم فرمائے علم فقہ میں ان کا مقام نہایت بلند ہونے کے ساتھ ساتھ علم فلسفہ میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے بخصوصیت کے ساتھ علم نجوم اور منجمین کے ساتھ تو انھیں والہانہ شیفتگی تھی۔

جب عباسی دور کے ساتویں خلیفہ، عبداللہ المامون بن الرشید بن محمد المہدی بن ابی جعفر منصور تک خلافت پہنچی تو انھوں نے اس کام کی تکمیل کر دی جسے ان کے دادا نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے علم کو ان کے مقامات سے تلاش کرنا شروع کیا اور اپنی بلند و بالا ہمت اور قوت آشنا طبیعت کی بدولت ہر قسم کے علم کو اس کے معدن سے نکالا۔ انھوں نے شہنشاہان روم سے تعلقات بڑھائے اور انھیں بیش قرار تحائف اور ہدایا بھیجے اور ان کے عوض میں ان سے یونانی اور رومی فلاسفہ کی کتابیں منگوائیں۔ چنانچہ انھوں نے مامون الرشید کو وہ تمام کتابیں مہیا کیں جو ان کے پاس موجود تھیں مثلاً افلاطون، ارسطاطالیس، ابقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس فلاسفہ کی تمام بلند پایہ تصنیفات اس کے بعد مامون الرشید نے بہتر سے بہتر ماہر مترجمین کی خدمات حاصل کیں اور ان سے بہتر سے بہتر تراجم کرائے حقیقت بھی یہی ہے، کہ جتنے بہتر سے بہتر ترجمے ممکن ہو سکتے تھے ان لوگوں نے وہ ترجمے کئے۔ اس کے بعد مامون الرشید نے لوگوں کو ان تراجم کے پڑھنے کا شوق دلایا اور ان علوم کو سیکھنے پر انھیں راغب کیا۔ چنانچہ مامون کے زمانہ میں علم کی ہر طرف وہ گرم بازاری ہوئی کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی بلکہ اس کے عہد میں حکمت ہی کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ بلند پایہ علماء ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ خلیفہ کے دربار میں علماء کی عزت افزائی اور تقرب خاص کے مناظر کھلی آنکھوں دیکھتے تھے۔ خلیفہ ان علماء کے

ساتھ خلوت و جلوت میں بیٹھتا اور ان کی باہمی بحثوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اپنے علوم کی بدولت لوگ خلیفہ کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز ہوتے تھے۔ خلیفہ کا یہی برتاؤ باقی علماء، فقہاء، محدثین، متکلمین، اہلِ لغت مورخین اور اربابِ شعر و نسب کے ساتھ بھی تھا۔ اس کے زمانہ میں علوم و فنون کے ماہرین اور طالبانِ علم کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو فلسفہ کی بہت سی شاخوں پر عبور رکھتی تھی۔ اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے انہوں نے طالبِ علم کا ایک منہاج اور طریقہ مقرر کر دیا، اور اصولِ ادب کی بنیادیں مستحکم کر دی تھیں حتیٰ کہ حکومتِ عباسیہ اس خصوصیت میں روما کی عظیم الشان حکومت سے جب کہ وہ اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچی ہوئی تھی کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہی (۱)

صاعد اندلسی ہی نے ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ "علوم فلسفہ میں سے جس علم کی طرف سب سے پہلے توجہ کی گئی وہ علم منطق اور علم نجوم تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے اس سلطنت میں علم منطق میں شہرت حاصل کی وہ ابوجعفر منصور کے میر منشی عبداللہ ابن المقفع خطیب ایرانی تھے۔ چنانچہ انہوں نے ارسطاطالیس کی ان تینوں منطقی کتابوں کا ترجمہ کیا جو منطقی صورت کے بارہ میں ہیں۔ وہ تینوں کتابیں "کتاب قاطاغوریاس" "کتاب باری ارمینیاس اور کتاب انولوطیقا" ہیں۔ ابن المقفع نے بیان کیا ہے کہ اس وقت تک باقی دو کتابوں کا ترجمہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ صرف پہلی کتاب کا اس سے پہلے بھی ترجمہ ہو چکا تھا۔ ان کتابوں کے ساتھ ہی ابن المقفع نے فورفریوس صوری کی مشہور کتاب "ایساغوجی" کا بھی ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ عبارت نہایت سہل ہے اور اصل سے قریب تر ہے۔ ان کے ساتھ ہی ابن المقفع نے ایک ہندی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جو "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ابن المقفع پہلے شخص ہیں جنہوں نے فارسی زبان سے عربی زبان میں ترجمے کئے۔

رہ گیا علم نجوم تو اس مملکت میں سب سے پہلے اس کی طرف محمد بن ابراہیم فزاری نے توجہ دی چنانچہ حسن بن محمد بن حمید المعروف بہ ابن الآدمی نے اپنی بڑی زیچ میں جو "نظم العقد" کے نام سے مشہور ہے بیان کیا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس ۱۵۶ھ میں ہندوستان سے ایک آدمی آیا جو ستاروں کی حرکات سے متعلق اس حساب کی کتاب کا عالم تھا جو "سند ہند" کے نام مشہور ہے . . . . . . منصور نے عربی زبان میں اس کتاب کو ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی خواہش ظاہر کی اس حساب کے مطابق ایک کتاب تصنیف کی جائے جسے عرب کے لوگ ستاروں کی حرکات کے سلسلہ میں اصل اور بنیاد بنا سکیں۔ چنانچہ محمد بن ابراہیم فزاری نے اس کام کا بیڑا اٹھایا چنانچہ اس عہد کے لوگ خلیفہ مامون کے زمانہ تک فزاری کی کتاب کے مطابق ہی عمل کرتے رہے ہیں۔

ترجمہ اور اس کی ترقی کے سلسلہ میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے پیشِ نظر رکھ کر ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے

(۱) طبقات الامم صفحہ ۷۵ و ما بعدہا

سکتے ہیں۔

(۱) اسلام میں پہلا ترجمہ خالد بن یزید بن معاویہ کی توجہ سے وجود میں آیا۔ اور جس شخص نے اس کے لیے ترجمہ کا کام انجام دیا وہ "اصطفن" تھا جو سکندریہ کا رہنے والا تھا۔ یہ ترجمہ یونانی اور قبطی زبانوں سے عربی میں کیا گیا تھا۔ ترجمہ سے خالد کا اہم ترین مقصد صنعتی اور فنی یعنی کیمیا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ مختلف معدنیات کو سونے (Au) میں تبدیل کرنے کا راز معلوم کرے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی داعی یہ بات ہوئی ہوگی کہ خالد ایک نوجوان آدمی تھا جسے خلافت کی طمع تھی۔ اس کے والد (یزید بن معاویہ) خلیفہ تھے۔ پھر اس کے بھائی (معاویہ بن یزید) خلیفہ ہوئے۔ اس کے بعد اسے خلافت سے محروم کر دیا گیا اور مروان بن الحکم سریر خلافت پر قابض ہو گئے جس کا خالد کو سخت صدمہ ہوا۔ اس صدمہ کے ماتحت وہ کسی ایسے شغل میں لگ گئے جو شریفانہ ہو اور ان جیسی شخصیت کے مناسب ہو۔ یہ مشغلہ صنعت ہی کا ہو سکتا تھا انھوں نے سمجھا کہ اگر وہ مختلف معدنیات کو سونے (Au) میں تبدیل کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ورنہ کم از کم علمی میدان میں ان کو وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا کہ خلفاء بھی ان پر رشک کیا کریں گے۔ ابن الندیم کا بیان ہے کہ خالد نہایت سخی آدمی تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز کسی نے خالد سے کہا کہ آپ نے تو اپنا اور اپنا بچھونا ہی اس فن یعنی کیمیا کو بنا لیا ہے تو خالد نے جواب دیا کہ میرا مقصد اس سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں (بھائیوں) کو بے نیاز بنا دوں مجھے توقع تھی کہ خلافت مجھے مل جائے گی مگر وہ مجھ سے چھین لی گئی۔ اب اس کی تلافی اس سے ہو سکتی ہے کہ میں اس فن کے آخری نقطہ تک پہنچ جاؤں تاکہ کوئی ایسا آدمی جو مجھے جانتا ہو یا جسے میں جانتا ہوں ——— اس کا محتاج نہ رہے کہ اسے طمع یا خوف کے ماتحت کسی بادشاہ کے دروازہ پر کھڑا ہونا پڑے۔" انھیں اس بنا پر علم نجوم سے بھی کافی لگاؤ تھا کیونکہ وہ ——— اس زمانہ کے خیالات کے مطابق ——— فن کیمیا کی تحصیل میں مددگار ہو سکتا تھا۔ کیونکہ علم نجوم اسی قسم کی باتوں سے گفتگو کرتا ہے کہ عالم اسفل میں ستاروں کے اثرات کیا ہوتے ہیں اور ان کے احکام کس طرح نافذ ہوتے ہیں۔ شاید انھیں یہ توقع تھی کہ فن کیمیا کی تحصیل کی جو آرزو انھیں ہے علم نجوم اس میں ان کی مدد کرے گا۔

(۲) دولت امویہ میں علم طب پر کسی قدر توجہ کی گئی۔ کیوں کہ لوگوں کو مادی طور پر اس کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں یہ ایک ایسا علم تھا جس کا علوم دینیہ پر کوئی مخالفانہ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو امیہ کے متقی ترین خلیفہ حضرت عمر بن ابن عبد العزیزؒ نے بھی طبی کتابوں کے ترجمہ کی اجازت دینے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کیا۔

(۳) بنو امیہ کے دور میں ترجمہ کا کام محض انفرادی طور پر انجام پاتا تھا۔ جو لوگ اس خدمت کو انجام دے رہے تھے ان کی موت سے یہ کام بھی ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن عباسی حکومت کے دور میں یہ افراد کا کام نہیں رہا تھا بلکہ ملت کا

(۱) الفہرست صفحہ ۳۵۲

کام بن گیا تھا۔ بلکہ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ مملکت عباسیہ میں ترجمہ کا ایک بڑا اسکول قائم ہو چکا تھا جسے کسی فرد بلکہ افراد کی موت سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔

(۴) اموی دور حکومت میں ترجمہ کا کام عملی علوم مثلاً کیمیا، طب اور نجوم تک ہی محدود تھا۔ اسی معنے میں جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اس کا دائرہ عقلی علوم مثلاً منطق، فلسفہ، ہندسہ وغیرہ تک وسیع نہیں ہوا تھا۔ یہ وسعت عباسی دور میں پیدا ہوئی۔

(۵) ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلسفہ کے ساتھ مسلمانوں کو لگاؤ ابتداءً ایرانیوں کی راہ سے پیدا ہوا۔ چنانچہ ابن المقفع نے منطق کی کئی یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ظاہر یہی ہے کہ ابن المقفع نے ان کتابوں کو ایرانی زبان سے ترجمہ کیا ہوگا۔ کیونکہ ان کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں یونانی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ ان کے بعد ترجمہ کا کام نسطوری اور یعقوبی فرقہ کے نصرانیوں نے سنبھال لیا جنہوں نے سریانی زبان سے عربی میں ترجمے کئے۔

(۶) عباسی خلفاء کو سب سے پہلے طب اور نجوم کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان دونوں علوم کی انہیں ذاتی طور پر ضرورت تھی۔ چنانچہ منصور کو طب کی اس لیے ضرورت پڑی کہ وہ بیمار تھا ـــــ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ـــــ اسے نجوم کی اس لیے ضرورت پڑی کہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ ہماری اس دنیا میں نحوست اور سعادت جو کچھ پیدا ہوتی ہے اس کا نجوم کی حرکات اور اوضاع سے کوئی خاص ارتباط ہوتا ہے[1]۔ چنانچہ اسی وقت سے طب اور نجوم رسمی ادارے بن گئے تھے جن کے لیے وہ حکومت میں بھی رسمی عہدے مقرر ہو گئے تھے جن پر خاص خاص لوگ ہی فائز ہوتے تھے۔ چنانچہ جورجیس بن جبرئیل بن بختیشوع جندیسابوری منصور کا شاہی طبیب بن گیا تھا۔ جب جورجیس بہت بوڑھا ہو گیا تو منصور نے اس کی جگہ پر اس کے شاگرد عیسیٰ ابن شہلاثا کو مقرر کر دیا۔ اس طرح نوبخت ایرانی کو منصور نے اپنا منجم مقرر کر لیا تھا اور جب وہ ضعیف ہو گیا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے ابوسہل بن نوبخت کو یہ عہدہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد جب مہدی تخت نشین ہوا تو اس نے عیسیٰ صیدلانی کو جس کا لقب ابوقریش تھا اپنا طبیب خاص مقرر کیا اور نوفیل بن توما نصرانی رہاوی کو رئیس المنجمین کا عہدہ دیا گیا۔ اس کے بعد جب ہارون رشید تخت نشین ہوا تو اس نے بختیشوع بن جورجیس اور یوحنا بن ماسویہ نصرانی کو اپنا طبیب مقرر کیا۔ اس کے بعد جب مامون تخت نشین ہوا تو اس کے دربار میں تو اطباء اور منجمین کی بڑی کثرت تھی۔ چنانچہ اس کے نجومیوں میں عیش ساسب عبداللہ ابن سہل بن نوبخت، محمد بن موسیٰ خوارزمی اور ماشاء اللہ یہودی جیسے علماء موجود تھے۔ اسی طرح اس کے اطباء میں سہل بن سابور، یوحنا ابن ماسویہ

---

(۱) کیسا غلط عقیدہ ہے (طلوع اسلام)

جو رجیس ابن بختیشوع، عیسیٰ بن حکم اور زکریا طیفوری جیسے حضرات پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد جب معتصم سریر آرائے مملکت ہوا تو اُس کا طبیب سلمویہ اور اس کے بعد یوحنا ابن ماسویہ ہوا (۱)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ طب اور نجوم ایسے فن بن چکے تھے جن کی خلفاء سرپرستی کرتے تھے۔ انھیں ان دونوں فنون کی عملی ضرورت تھی۔ طب کی بات تو ظاہر ہی ہے۔ مگر تاریخ ایسی حکایات سے بھری پڑی ہے کہ خلفاء نجومیوں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتے تھے۔ منصور نے نجومیوں سے مشورہ کیا کہ ایسا وقت اور گھڑی منتخب کی جائے جس میں بغداد شہر کی تعمیر شروع کرائے۔ مہدی نے جب "ماسبذان" کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو توفیل بن نوما نصرانی منجم سے مشورہ کیا (۲)۔ معتصم کو نجومیوں نے نصیحت کی کہ وُہ "عموریہ" پر صرف ان دنوں میں حملہ کرے جب کہ تہ انجیر اور انگور پکنے شروع ہو جائیں مگر معتصم نے ان کی بات پر کان نہیں دھرے۔ اس نے عموریہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا ابو تمام نے اسی سلسلہ میں اپنا مشہور رائیہ قصیدہ کہا تھا جن کا پہلا مصرع یہ ہے۔

اَلسَّیْفُ اَصْدَقُ اَنْبَاءً مِنَ الْکُتُبِ

(تلوار، کتابوں سے زیادہ سچی خبریں دینے والی چیز ہے)

واثق کی بیماری نے جب شدت اختیار کی تو نجومیوں کو بلایا گیا جن میں حسن بن سہل بن نوبخت بھی تھا۔ انھوں نے اس کے زائچہ پر غور و فکر کرنے کے بعد بتایا کہ واثق ابھی مزید پچاس سال زندہ رہے گا۔ مگر ان کے ایسا کہنے کے دس دن بعد ہی واثق کا انتقال ہو گیا (۳)

ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ خلفاء صرف اسی نوع کے علم نجوم کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ علم نجوم ایک وسیع علم تھا جس میں وُہ فن بھی شامل تھا جسے ہم آج علم ہیئت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس میں ان تغیرات کی بحث بھی شامل تھی جو مواقع نجوم اور ان کی تاثرات سے زمین میں پیدا ہوتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں یُونانیوں کے ہاں پائی جاتی تھیں۔ اور عباسی خلفاء نے ان دونوں ہی کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مامون کے عہد میں رصد گاہوں سے ستاروں کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ آلات رصد قائم کئے جا چکے تھے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ احکام نجوم معلوم کرنے کا شغف ہی تھا جس نے ابتداءً خلفاء کو علم نجوم کی طرف کھینچا اور اس علم کی سرپرستی پر آمادہ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وُہ خالص فلکیات اور ریاضیات کی طرف بھی مائل ہوتے چلے گئے

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں علم (طب اور نجوم) ہی وُہ دونوں دروازے تھے جنھوں نے مسلمانوں کو

---

(۱) ابن العبری مختصر تاریخ الدول صفحہ ۲۳۵ (۲) ابن العبری صفحہ ۲۱۹ (۳) ابن العبری صفحہ ۲۴۵

علوم فلسفیہ کے میدان تک پہنچایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تخصص (SPECIALIZATION) جو آج ہمارے ذہنوں میں آتا ہے اور جسے ہم طب اور ہیئت کی تعلیم میں آج دیکھتے ہیں اس عباسی عہد میں معروف نہیں تھا طبیب اور منجم کو بہت سے فلسفیانہ مسائل کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ فلسفہ ایک ایسی وحدت تھی جس فروع طب، آلٰہیات، حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ اور ہیئت تھیں۔ طبیب اور منجم کو ــــ عام طور سے ــــ ان سارے علوم سے واقف ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ طب اور نجوم میں تبحر حاصل کرتے تھے۔ چونکہ اطباء اور نجومیوں کو اپنے ان تمام فنون کو عمدگی کے ساتھ حاصل کرنے کا شوق ہوتا تھا اس لیے وہ اجنبی زبانوں کو بھی سیکھتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ یونانی زبان کو۔ جب انہیں یونانی زبان اچھی طرح آجاتی تھی تو وہ زبان کی تمام کتابوں ہی کا مطالعہ کرتے تھے جو فلسفہ کی تمام شاخوں میں تصنیف کی گئی تھیں۔ ابن الندیم نے ان بے شمار کتابوں کے نام گنائے ہیں جو اس کے زمانہ میں علم طب حاصل کرنے والے درس و تدریس پڑھا کرتے تھے۔ ان میں طب، تشریح الاعضاء اور متعلقات طب کے علاوہ منطق، اخلاق، ماوراء المادہ سے متعلق مباحث وغیرہ سب ہی چیزیں ہوتی تھیں۔ جو کتابیں وہ پڑھتے پڑھاتے تھے ان میں سب سے ایک کتاب کا تو موضوع ہی یہ تھا کہ "ایک فاضل طبیب کے لیے فیلسوف ہونا لازمی ہوتا ہے"(۱) یہی حالت برابر قائم رہی تاآنکہ مسلمان فلاسفہ میں سے آگے چل کر جو نامور فلسفی پیدا ہوئے ان کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ یعقوب کندی ــــ مثال کے طور پر ــــ طب فلسفہ، علم حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ، طبائع اعداد اور ہیئت کے زبردست عالم تھے(۲) اسی طرح ابن سینا ایک منطقی، طبیب، ریاضی دان، فلسفی اور ماہر فلکیات تھے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے اطباء اور نجومی جنہیں خلفاء کی طرف سے بیش قرار مالی امدادیں ملتی تھیں انہوں نے ایسی کتابوں کے ترجمے کئے جو نہ طبی تھیں اور نہ فلکیات سے متعلق تھیں۔ یا کم از کم انہوں نے ایسی کتابوں کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ ابن العبری کا بیان ہے کہ یوحنا ابن ماسویہ نصرانی سریانی طبیب کو ہارون رشید نے قدیم طبی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا۔ . . . . یوحنا کی بڑی عمدہ تصانیف تھیں۔ وہ غور و فکر کے لیے اپنی مجلس میں بیٹھتا تھا اور پرانے علوم سے متعلق ہر نوع کے مسائل اس کے سامنے آتے تھے اور وہ ان تمام مسائل پر بہترین عبارت میں روشنی ڈالتا تھا(۳) نیز طبری ہی کا بیان ہے کہ یوحنا بن بطریق طبیب ترجمانی جو مامون کا آزاد کردہ غلام تھا فلسفیانہ کتابوں کے ترجمہ کا نگران تھا۔ وہ مضامین کو بہترین الفاظ کا جامہ پہنانے میں کمال رکھتا تھا البتہ عربی بولتے ہوئے اس کی زبان لکنت کرتی تھی۔ طب کی بہ نسبت اس پر فلسفہ کا زیادہ غلبہ تھا(۴)

---

(۱) الفہرست صفحہ ۲۸۹ و مابعد۔ (۲) القفطی صفحہ ۲۹۵ (۳) قفطی صفحہ ۲۴۸ (۴) ایضاً صفحہ ۲۳۹

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

اقبالؒ

اِحتسابُ

تحریک پاکستان کی تائید اور حمایت میں طلوعِ اسلام کی داستانِ جہاد، سینکڑوں نہیں، ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ہزاروں صفحات ہماری زندگی کی مقدس ترین آرزوؤں کے ترجمان تھے اور ان تحریروں کا ایک ایک لفظ خونِ جگر سے لکھا گیا۔ ہمیں فخر ہے کہ اس راہ میں ہم نہ تو کسی کی اندھی تقلید کے قائل تھے اور نہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی رضا جوئی ہمارا مقصود۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ جہاں تک احیائے دین کی مقدس آرزوؤں کا تعلق ہے وہ ایک جیتے جاگتے اور محسوس و مشہود نظامِ زندگی کے پیکروں میں ہی تکمیل پاسکتی ہیں اور ایک نظامِ حیات معاشرہ یا مملکت کے قیام کے لئے ایک خطۂ زمین کا حصول ناگزیر ہے۔

بعض لوگ شاید اس خود فریبی میں مبتلا رہے ہوں (اور اب بھی ہوں)، کہ اس خطۂ زمین کے حصول سے تحریک پاکستان کا مقصد پورا ہوگیا لیکن ہمارے نزدیک معاملہ اس سے کہیں آگے تھا اور یہ اگلی منزل (خطۂ زمین کے حصول سے بھی)، کہیں زیادہ اہم تھی۔ ہمارے نزدیک اگر اس سرزمین پر نظامِ خداوندی کا آفتاب جلوہ بار نہیں ہوتا اگر یہ مملکت اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا نہیں اٹھتی۔ اور اگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے یہاں خدائی قوانین کارفرمائی کا سرچشمہ قرار نہیں پاتے تو جس مقصد کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ تھی کہ حصولِ پاکستان کے بعد جب نئی منزل ہمارے سامنے آئی تو ہم نے اس منزل پر اربابِ اقتدار کے اُٹھتے ہوئے ہر قدم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور جہاں کہیں ہمیں یہ نظر آیا کہ تحریک پاکستان کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے داغدار ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ ہم نے پوری قوت سے اس کا محاسبہ کیا۔ یہ محاسبہ اور مواخذہ اس قسم کی تخریبی اور انتقامی

ذہنیت سے قطعاً پاک تھا جو تحریک پاکستان کے شکست خوردہ مخالفین، تحریک پاکستان کے کارفرماؤں کے خلاف، اپنی نفسیاتی کشمکش کی بنا پر بروئے کار لا رہے تھے۔ اس لئے ہم نے جو کچھ کہا جذباتی روش سے بالاتر رہ کر کہا اور جن خرابیوں کی نشاندہی کی وہ علیٰ وجہ البصیرت کی۔ ہمیں بخوبی احساس تھا کہ جس فتح عظیم کی تاریخ میں ہمارا خون جگر شامل ہے اس کی عظمت کو قائم رکھنا کس قدر ضروری ہے اس لئے ہم جو کچھ ان کالموں میں بروئے تحریر لاتے رہے اس کے ایک ایک لفظ میں ہمیں پوری پوری ذمہ داری ملحوظ رکھنی پڑی اور ہر ممکن حزم و احتیاط سے کام لیا گیا۔ بالخصوص یہ ذمہ داری کہ ہمارے قلم کی ہلکی سی جنبش بھی ایسی نہ ہو جس سے اس سرزمین کے استحکام پر خفیف سا بھی اثر پڑے۔

قوموں کی زندگی میں ایام رفتہ کا احتساب ایک خاص افادیت رکھتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

مملکتِ پاکستان کی زندگی کے گذشتہ سالوں میں طلوع اسلام نے اس نقطۂ نظر کے تحت اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا اُس کا سلسلہ گذشتہ چودہ سال کی مسلسل اشاعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ تحریک پاکستان کے کسی مخالف کی انتقامی اور انتشار پسندانہ تنقید نہیں، بلکہ اس تحریک کے مخلص ترین رفیق سفر کے فریضۂ رفاقت کی پکار ہے۔ یہاں ہم اس سلسلۂ تحریر کا جستہ جستہ ملخص اس مقصد کے تحت منظر اشاعت پر لا رہے ہیں کہ واقعات کی رفتار میں گزرے ہوئے ایام کی کچھ یادیں از سر نو تازہ ہو جائیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

طلوع اسلام کے دور جدید کا آغاز (جنوری - فروری ۱۹۴۸ء کے مشترکہ شمارہ سے) آزادی اور استقلال کی فضا میں ہوا۔ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت نے ابھی اپنی عمر کی پہلی ششماہی بمشکل پوری کی تھی۔ اپنی اس مختصر اور ننھی سی عمر میں ہی اسے پے در پے کس قدر زخم کھانے پڑے۔ اس کا سفینۂ حیات کیسی تند و تیز یورشوں کی زد میں تھا اور اقتدار کے نئے نئے نشے سے سرشار امراء و وزراء اپنی نازک ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر کن سرمستیوں میں کھو گئے تھے۔ یہ سارے مناظر اپنی دل دوز اور جگر سوز کیفیتوں میں طلوع اسلام کے سامنے تھے۔ اس کے صفحات لرزتے ہوئے دل کے ترجمان اور خون کے آنسوؤں سے تر بتر تھے۔ اپنے فریضۂ ملّی کے پیش نظر ہمیں تلخ نوائی سے بھی کام لینا پڑا ــــــ

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو

چنانچہ دورِ جدید کے اس پہلے شمارے کا افتتاح اس عزم صمیم سے ہوا کہ

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

پھر اقبالؒ کے الفاظ میں، دعا، اور حضور رسالت مآبؐ میں شوقِ نیاز کی وارفتگی شامل تھی۔ اس شمارہ کا انتساب "شہدائے کشمیر کے مقدس خون" سے تھا۔ اور ازاں بعد اپنی ملی آزادی کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کے بعد طلوع اسلام نے زخم خوردہ ملت کے حضور میں اس کے زخموں کی داستان حسب ذیل الفاظ میں پیش کی۔

یہ ٹھیک ہے کہ

ہماری تباہی و بربادی، نکبت و زبوں حالی، ویرانی و خانماں خرابی، قتل و غارتگری اور دیگر ہجوم مصائب اور اندوہ تکالیف کی ذمہ داری ایک حد تک ہمارے ارباب حل و عقد کی ناعاقبت اندیشی اور غلط روی پر ہے۔

ذمہ دار کون؟

ہماری موجودہ کس مپرسی اور بیچارگی، مفلسی اور محتاجی، بے سروسامانی اور لاوارثی بڑی حد تک عمائدِ حکومت کی تغافل کیشی اور تساہل انگاری کی وجہ سے ہے

ہماری پریشانیاں اور رسوائیاں ایک گونہ ان کی بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کا نتیجہ ہیں۔

ہمیں کھانے کے لئے روٹی، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کو مکان اور دیگر ضروریات زندگی بآسانی میسر آسکتی تھیں۔ اگر افسران متعلقہ میں بددیانت اور خائن، نالائق اور ناہنجار نہ ہوتے۔

ہماری مجبوریوں کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا اگر ان ارباب نظم و نسق میں ایسے لوگ نہ ہوتے جو مزدوروں کے کفن تک اتار لینے میں کوئی باک نہ سمجھتے ہوں۔

ہماری بہت سی قیمتی جانیں جو حدود پاکستان میں پہنچنے کے بعد بھوک اور سردی کی نذر ہو گئیں ضائع ہونے سے بچ سکتی تھیں اگر یہ جمود و تعطل کی برف کی سلیں جو ہمارے سروں پر مسلط ہو چکی ہیں؛ جذبات مہر و محبت کی گرمی سے بروقت پگھل جاتیں ....

یہ سب کچھ بجا اور درست ہے۔

اور پھر۔۔۔ اس کے بعد قوم کے سامنے اس کے نئے فرائض حیات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے آخر میں بتایا کہ

اسے بھول جاؤ کہ یہ اربابِ دولت وسطوت اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ صرف یہ یاد رکھو کہ پاکستان کے خطۂ زمین کے تحفظ کے لئے آپ نے کیا کرنا ہے۔

اگر آپ نے اسے یاد رکھا تو

یہ سب طرہ بازانِ دجل وفریب اس انقلاب کے سیلاب میں بہ جائیں گے جو آپ کے ہاتھوں سے وجود میں آئے گا۔ اور اس وقت صرف وہی سرفرازی کی زندگی بسر کرے گا جو شرفِ انسانیت کے جوہر سے بہرہ یاب ہوگا۔ (طلوعِ اسلام جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۱۴۔۱۵)

ملتِ پاکستان کو اس طرح اپنی اہم ذمہ داریوں سے خبردار کرنے کے بعد اس نے حکامِ پاکستان کو یوں بیماری کا پیغام دیا۔

انگریز چلا گیا لیکن

وہی دیرینہ بیماری

اس کے نظامِ حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا تم نے انہیں بدستور قائم رکھا ہے بلکہ وہ برائیاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک، انگریز کے خوف یا شرم سے دبی دبی سی رہتی تھیں اُبھر اور نکھر کر اوپر آگئیں۔ خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساطِ سیاست وحکومت بدل گئی لیکن تمہارے قلب ونگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
تم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی

وہی اپنوں سے بیگانگی ومغائرت، وہی مصنوعی رعب وداب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اعزہ پروری وجنبہ داری، وہی ظلم واستبداد، وہی جور وستم، کوئی دادخواہ نہیں جو تمہارے ہاتھوں نالاں نہ ہو۔ کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمہاری نازیبائی سلوک کا شکوہ سنج نہیں......

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمہیں بدل دیگا۔ اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ اُلٹ جایا کرتا ہے۔

(ایضاً صفحہ ۱۶)

اس کے بعد اپنے دور جدید کی اِسی اوّلیں اشاعت میں، طلوع اسلام نے "پس چہ باید کرد" کے عنوان سے زخم خوردہ افرادِ ملت کے غیظ و غضب کو قدرے تند و تیز الفاظ میں پیش کیا تاکہ اپنے عشرت کدوں کی بدمستیوں میں کھوئے ہوئے حکمران سُن لیں کہ عوام کے غم و غصّہ کی کیفیت کیا ہے۔ عوام کی اس چیخ و پکار کی ترجمانی اس نے بدیں الفاظ کی ۔۔۔

عوام کی چیخ و پکار کیا یہی ہیں وہ حکومتِ الٰہیّہ کے ایوان خاص کے عمائد و اراکین جن کی شیطنت پر انسانیت روتی اور آدمیت آنسو بہاتی ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد، تملق، اعزہ پروری، احباب نوازی؛ کیا یہی ہیں وہ خصوصیات جن کی خاطر غیروں کی حکومت پر اپنی حکومت کو ترجیح دی جاتی تھی؟ نااہلی، غلط اندیشی، تساہل انگاری، وعدہ خلافی، کام چوری، ملت فروشی، خود غرضی، خودستائی، ہوس پرستی، زراندوزی؛ کیا یہی ہیں وہ معیار جن کی بنا پر ارباب حکومت و سطوت کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا؟ اسلام خطرے میں ہے؛ ملت تباہ ہو رہی ہے؛ قوم ڈوب رہی ہے؛ کیا یہ سب نعرے اس لئے لگائے جا رہے تھے کہ ان اکابرین کے اپنے مفاد خطرے میں تھے؟ .... (ایضاً صفحہ ۹)

اور عوام کی چیخ و پکار کا یہ تلخ و طویل سلسلہ پیش کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ

یہ ہیں وہ خیالات جو آجکل عام طور پر فضائے پاکستان کو عفریتی بگولوں کی رقص گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر یاس و قنوطیت کے آئینہ دار ہیں جو ناقابلِ برداشت آلام و مصائب سے پیدا ہو چکی ہیں۔ کچھ ان موہوم امیدوں کی شکست کی صدائیں ہیں جو لوگوں نے اپنے دلوں میں خود ہی پیدا کر لی ہیں۔ اور جن کے بر دئے کار نہ آنے سے وہ جھنجھلا اٹھے ہیں۔ کچھ ایسے نشتروں کی حیثیت لئے رہتے ہیں جنہیں طبیب مشفق، زہر آلود ناسور کی جراحت کے لئے بطور علاج تجویز کر رہا ہے...... ان خیالات کے محرک اسباب و علل کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اس وقت پوری کی پوری قوم کے دماغی توازن اور قلبی سکون کو کھو رکھا ہے .... (ایضاً صفحہ ۹)

یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے طلوع اسلام نے صورت حال کی اصلاح کے لئے جو نکات پیش کئے ان میں یہ بھی کہا گیا کہ جو نالائق اور بددیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسانید اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے اسے'

اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر، اس کے اصلی مقام کی طرف لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقے کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کو اٹھانے کے اہل ہو جائیں۔ (ایضاً ——— صفحہ ۹۹)

آگے بڑھیئے: اس کے بعد طلوعِ اسلام کے دورِ جدید کا دوسرا شمارہ ملت کی دھڑکنوں کا ترجمان بن کر سامنے آیا اپنے لمعات میں پاکستان کے سیکرٹیریٹ کے دفاتر اور امراء و وزراء کے عشرتکدوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس نے حکومت کو ایک اہم فروگذاشت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھا۔

ایوانِ حکومت میں مسجد کیوں نہیں؟

ہائیں ہمہ دفاتر اور متعلقین دفاتر کی روز مرہ کی ضروریات کے لئے مناسب انتظامات کرنے ہی پڑے دفاتر کے لئے کچھ نہ کچھ عمارات بھی بنوانی پڑیں فرنیچر اور دیگر سامان میراق کچھ مستعار لیا اور کچھ خرید لیا گیا۔ عملے کی رہائش کے لئے مکانات تعمیر کرانے پڑے۔ دفاتر میں عملے کے لئے ٹفن روم۔ موٹروں کے لئے گیراج۔ متعلقینِ دفاتر کی ضروریات کے لئے ہسپتال، اسکول، بڑے بڑے حکام کے لئے کوٹھیاں، بنگلے، کسی نہ کسی طرح مہیا کئے ہی گئے۔ ان سب چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی لیکن اس اسلامی سلطنت میں اگر کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تو وہ مسجد تھی۔ دفاتر کے عملہ میں سے جو "قدامت پرست" اس "زمانۂ تہذیب و تمدن" میں ہنوز عہدِ کہن کی "رسم نماز" کی پابندی ضروری سمجھتے تھے انہوں نے کسی کونے اور گوشے میں اپنے لئے سجدہ گاہ تجویز کر لی، جنہیں ایسی جگہ میسر نہ آئی وہ کسی درخت کے سائے میں جا کھڑے ہوئے،

آپ ظہر کی نماز کے وقت، دفاتر کی ان عالیشان عمارات میں جا نکلئے اور ان کے درخشندہ پس منظر میں، نمازیوں کے اجتماع کو دیکھئے تو فرطِ ندامت سے آپ کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں گی آپ دیکھیں گے کہ کسی درخت کے سائے یا دیوار کی اوٹ میں، چند پتھروں سے ایک احاطہ کی نشان دہی کر لی گئی ہے اور اس احاطہ کے اندر، فرشِ خاک پر، چند بوسیدہ چٹائیاں بچھ رہی ہیں اور ان پر یہ متعلقین مملکت خداداد پاکستان، اپنے رب کے حضور، رکوع و سجود میں مصروف ہیں۔ جن کی پیشانیوں کی خاک اور کپڑوں سے لپٹا ہوا گرد و غبار، سنگِ مرمر پہ بچھے ہوئے ان قالینوں کی یاد دلا رہا ہے جنہیں ان کے جوتے ابھی ابھی مسل کر آئے ہیں۔ اس شان و

شوکت اور تزک و احتشام کو دیکھئے اور پھر اس بے سروسامانی پر نگاہ ڈالئے۔ اور اس کے بعد ــــ
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے ــــ

(طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۲۲ - ۲۳)

اسی اشاعتِ مارچ میں "باب الاسلام سندھ" کے عنوان سے 'طلوع اسلام' ان جگر پاش مناظر کو سامنے لاتا ہے جو کسب معاش کی سرگردانی میں مبتلا مہاجرین کی گرفتاریوں کی صورت میں بپا تھے۔ اس نے جرأت مندانہ اخوت اور ہمدردی کے تقاضوں کو لبیک کہتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا۔

مہاجرین سے بے رحمی کیوں؟

حکومت نے ان غریب الدیاروں اور بے یاروں کو کوئی مراعات نہیں دیں۔ نہ انہیں دوکانوں کے لئے کوئی جگہ دی نہ رہنے کے لئے مکان اور نہ کاروبار شروع کرنے کے لئے ضروری سرمایہ بہم پہنچایا۔ لیکن جب ان لوگوں نے شبانہ روز محنت وجانفشانی سے رہگذر پر بیٹھ بیٹھ کر کسب معاش کی حقیر صورتیں پیدا کیں تو حکومت کا قانون فوراً حرکت میں آیا، اور ان پر ذریعۂ معاش بند کر دیا۔ چنانچہ ان بدنصیبوں کو پٹڑیوں پر سے اُٹھا دیا گیا۔....... اب ہماری ہمہ گیر حکومت کی دسترس سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ موت کے مُنہ سے، جان جوکھوں میں ڈال کر، جان بچاکر پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے والے نیم مردہ، پاکستان میں بھی موت ہی کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ دشمنوں کی سفاکیوں کی نذر ہو جاتے؟ کم از کم وہ اس تلخی اور مایوسی کا شکار تو نہ ہوتے کہ جس پاکستان کی خاطر انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، وہی ان کی رسوا کن موت کا باعث ہوا۔ جسے وہ جنت سمجھ رہے تھے وہ جہنم ثابت ہوا۔ وہ پھول چننے کے لئے بڑھے تو ان کی انگلیوں میں کانٹے پیوست ہوئے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے پاکستان کے قلب میں اُترے تو انہیں ٹھکرا دیا گیا۔ وہ روٹی مانگتے نہیں تھے۔ انہوں نے خون پسینہ ایک کر کے روٹی کمائی اور حکومت پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ لیکن حکومت نے ان کی کمائی ہوئی روٹی ان سے چھین لی اور انہیں اور ان کے بھوکے بیوی بچوں کو بے رحم قانون کے رتھ کے نیچے کچل دیا۔ (ایضاً صفحہ ۹)

دل کے زخمی تاروں کو یوں چھیڑتے ہوئے اس نے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر گہری اور حقیقت کشا طنز سے کام لیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک لرزہ انگیز وعید سب کے سامنے رکھ دی۔ اس نے لکھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ خوبصورت کراچی کی کشادہ سڑکوں کی دیدہ زیب پٹڑیوں پر یہ عرق ریز انسانی گروہ، بھدے، بدصورت، مفلوک الحال انسان کلنگ کا ٹیکہ تھے۔ وہ امراء ورؤسائے شہر کے لئے تھوکرتے تھے۔ دختران تہذیب نو کے لئے ان کا نظارہ بھیانک تھا۔ وہ انسان نہیں تھے بے جان پتھر تھے۔ ان پتھروں کا راستے سے ہٹا دینا ہی بہتر تھا۔ اب کشادہ شاہراہیں، کشادہ روشیں پھر سے سیر و تفریح کے لئے کھلی ہیں۔ کلی شوق اور پورے اطمینان سے ٹہلئے اور بھول جائیے اس قیامت کو جس کے اثرات سے یہ پریشاں روزگار انبوہ در انبوہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہ نفاست و نزاکت بجا اور درست! لیکن قسم ہے اس خدائے قدوس کی جس نے ربّ العالمین اور خیر الرّازقین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے کہ دنیا بھر کی نزاکتیں اور لطافتیں جہنم میں جھونک دینے کے قابل ہیں اگر وہ کسی ایک انسانی بچہ کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر وجود میں لائی گئی ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۹۱)

اور پھر حسب ذیل الفاظ میں نشۂ اقتدار کے دیوانوں پر واضح کیا کہ

حکومت محض قانون کا نام نہیں۔ اس کا کام قانون پاس کر دینا یا رائج کر دینا ہی نہیں۔ اس کے فرائض بھی ہیں۔ وہ قانون کی آڑ لے کر اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ مہاجرین کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرتی جہاں وہ کاروبار کر سکتے۔ ان کے لئے مناسب رہائش گاہیں مہیا کرتی تاکہ عام راہوں پر سونے کی بجائے وہ ان مقامات پر شب باشی کر سکتے اور شہر کی صحت کے لئے خطرے کا موجب نہ بنتے۔ لیکن حکومت نے اپنے فرائض سے مجرمانہ پہلو تہی کی اور جب مہاجرین از خود راہ ہائے عمل تراشنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سعی و عمل کو قانون کی ایک ہی حرکت سے اکارت کر دیا۔ (ایضاً صفحہ ۹۲)

اسی اشاعت میں "مجلس دستور ساز کے ارکان سے" کے زیر عنوان طلوع اسلام نے پہلے کارفرمایانِ ملک پر حصول پاکستان کا مقصد واضح کیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کی ناگزیری واضح کرتے ہوئے ان کارفرماؤں کے اس طبقہ کی نشان دہی کی جو تمام مواعید کو پس پشت ڈال کر اسلامی دستور سے گریز کی راہیں اختیار کر رہا تھا اور سیکولرازم کی حمایت میں مکروہ سازشیں بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ ان ممتاز عناصر کے چہروں سے دل فریب نقاب "اُلٹتے" ہوئے اس نے لکھا۔

اسلامی نظام سے روگردانی اوّل الذکر گروہ سے جو "ایماندار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے، خطاب فضول ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوۂ دانش فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لندن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔

دوسرا گروہ وہ ہے جسے ہم "بے ایمان ایماندار" کہہ سکتے ہیں...... یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے، یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بات کہتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی امید ہو سکتی ہے..... اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام و قرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو ان کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے........ ان لوگوں سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے جس قدر جلد وہ اس فریب کاری، طمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں بہتر ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۰)

واضح رہے کہ یہ دور ایک نوزائیدہ مملکت میں تعمیر کا آغاز تھا۔ اس مرحلہ پر اگر ایک اینٹ بھی غلط رکھی جاتی تو ایوان مملکت کی دیواریں ٹیڑھی ہو کر رہ جاتیں۔ چنانچہ طلوع اسلام نے وقت کے اہم ترین تقاضوں کی بجا آوری میں پوری ذمہ داری سے مثبت اور تعمیری تنقید کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ارباب اقتدار نشۂ حکومت میں عوام سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اگلی اشاعت میں اُس نے پوری قوت سے ارباب بست و کشاد کو اس روش کے انجام سے آگاہ کیا۔ اس کے مقالہ کا عنوان تھا۔

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور اس عنوان کے تحت اس نے لکھا۔

.... کیا جن عوام کے خون اور پسینہ پر آپ کے قصرِ حکومت کی بنیادیں قائم ہیں

عوام کی بے اعتمادی

ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ آپ انہیں بتائیں کہ آپ کی ضروریات کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ عوام آپ کے لئے کیوں مزید قربانیاں دیں؟ کیا قربانی کے یہ بکرے اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے خون کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟

ضمیر کائنات میں پہلو بدلنے والی تبدیلیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قوم کو گونگا اور خاموش مجمع سمجھ لیا جائے۔ یا انہیں اس وادیٔ سکوت —— اور جمود —— میں رکھا جائے۔

(شمارہ اپریل ۱۹۴۸ء صفحہ ۹۳)

ان نئے تقاضوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے کارفرمایان مملکت کو احساس دلایا کہ

ہم ارباب حکومت پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نبض ملت کا احساس کر رہے ہیں انہیں ملت کا اعتماد حاصل نہیں۔ یہ عدم اعتمادی اگر کسی صحیح ترقی یافتہ جمہوری ملک میں پائی جاتی تو حکومت کب کی شکست کھا چکی ہوتی .... یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس وقت ملت حکومت کو 'اپنی' نہیں سمجھتی۔ وہ اسے بدستور اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے حکومت نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ارباب حکومت، مشینوں کی طرح پہلے سے طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق حکومت کر رہے ہیں اور بس۔ وہ خود اس احساس و شعور سے، تہی معلوم ہوتے ہیں کہ اب حکومت 'اپنی' ہے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی "اور" کا ملازم تصور کرتے ہیں۔

اے کاش اس "اور" سے مراد ملت ہوتی!

(ایضاً صفحہ ۹۵)

مرکزی حکومت نے علامہ اقبالؒ کی یاد منانے —— یوم اقبال —— کی تعطیل کے بارے میں جس بے حسی اور پھر ادارۂ طلوع اسلام کی اس سلسلے میں وضاحتی مراسلت کے جواب میں جس مضحکہ خیزی کا ثبوت دیا اس پر طلوع اسلام نے لکھا۔

کوتاہیٔ فکر و نظر

یہ ہے ہماری مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد کا حال۔ ہمیں یقین ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں بھی کوتاہیٔ فکر و نظر اور بدسلیقگی کا اس سے بدتر نمونہ کبھی نہ پیش ہوا ہوگا۔ ۲۱ راپریل کی چھٹی دیکھئے اور اس کے بعد اسی محکمہ اور انہی صاحب کے دستخطوں سے ۲۰ راپریل کی۔ اور پھر روئیے اس قوم کی قسمت پر جس کے کارپرداز

اس قسم کے واقع ہوئے ہوں؛ (طلوع اسلام ۔ مئی ۱۹۷۰ء ۔ صفحہ ۸)

انہی ایام میں "یوم عالم اسلام" کی تقریب پر کراچی میں تقریر کرتے ہوئے ملک فیروز خاں نون نے کہا کہ مسلمانان پاکستان کو اسلام کا مفہوم ترکی اور ایران جیسے "ترقی یافتہ" ممالک سے سمجھنا چاہیئے۔ ملک صاحب کی تقریر کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے طلوع اسلام نے "اسلامی حکومتیں" کے عنوان سے اس مضحکہ خیزی کا یوں پوسٹ مارٹم کیا۔

اسلامی حکومتوں کی انوکھی مثال

.....اس وقت ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلامی حکومتوں کی بہترین مثال ترکی اور ایران ہے ترکی کانوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے کہ ہماری حکومت اسلامی نہیں۔ غیر دینی (SECULAR) ہے۔ اور ایران پر اس ملوکیت کی لعنت مسلط ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے اکابر جن سے مسلمان توقع وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے جو مسلمانوں کو اسلام فہمی کے لئے ترکی اور ایران کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں ان کی اسلام فہمی کو ہزار سلام۔ اس سہاگ سے تو رنڈاپا اچھا۔

(طلوع اسلام جون ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۰)

پاکستانی سکوں کے ڈیزائن اور نقوش کی اصلاحوں میں ہندوستانی سکوں کی جس کورانہ تقلید سے کام لیا گیا اس پر اسلامی تقاضوں کی روشنی میں طلوع اسلام نے کڑی تنقید کی اور اس کے آخر میں لکھا۔

اندھی تقلید

ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت پاکستان کے کارندے ۔۔۔۔ الا ماشاءاللہ ۔۔۔ ندرتِ فکر و عمل سے معرا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا انداز کار دفتری ہے اور دفتر کا مثالی نمونہ ان کے نزدیک ہندوستان ہے۔ پاکستان کے دفتری نظام کو یہ دیمک چاٹ رہی ہے۔ یہ اکاس بیل دن بدن پھیل رہی ہے اور نظام پژمردہ ہو رہا ہے پاکستان کو ان پامال راہوں اور فرسودہ روایات کو لامحالہ ترک کرنا پڑے گا۔ (ایضاً صفحہ ۲۱)

اخبار "ڈان" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستان کے وزیر مالیات ملک غلام محمد (مرحوم) ایک شام کلفٹن کے ساحل پر پتنگ بازی کا شغل فرما رہے تھے۔ اتنے میں ان کے ایک اور وزیر بھائی وہاں پہنچے اور وہ بھی اس رنگین مشغلہ میں ان کے شریک ہو گئے۔ پاکستان کی زندگی میں بڑے نازک مسائل کا ہجوم اور اس کے وزرائے کرام کی یہ مشغلہ بازیاں۔ طلوع اسلام نے "پاکستانی وزراء کے مشاغل" کے عنوان سے اس سلسلے میں گہری طنز کا جو اثر انگیز پہلو اختیار کیا وہ ملاحظہ ہو۔

پتنگ بازیاں

اقبالؒ کو ساحل کی بزم آرائی سے اصولی اختلاف تھا کہ ۔۔۔ آنجا

نوائے زندگانی نرم خیز است

اقبالؒ نے محض اظہار اختلاف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ مشورہ دیا کہ

بدریا غلط و با موجش در آویز

حیات جاوداں اندر ستیز است

ہمارے وزراء اقبالؒ سے اس حد تک تو ضرور اتفاق کر سکے کہ ساحل تک محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ آگے بڑھے لیکن پار آب نہیں بلکہ پار ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کے ہنگاموں سے فارغ ہو چکے ہوں اور سعدی کے الفاظ میں آسمان پروازی شروع کر دی ہو۔ یا ہوا کو آب پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وزارت ۔۔۔ بلکہ خود پاکستان ۔۔۔ باد آورد ہے ۔۔۔ یعنی آندھی کے بیر ۔۔۔ لیکن یہ مشق بہر حال اچھی تھی کہ پاکستان میں ہنوز ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲)

۶ر اپریل ۱۹۴۸ء کو پناہ گزینوں کی امداد کے نام پر مستورات لاہور کی "پناہ گزینوں کی امدادی کمیٹی" نے لاہور میں ایک مینا بازار کا "جشن رچایا"۔ اس جشن کی رنگینیوں کی جو رپورٹ "ڈان" میں شائع ہوئی وہ غیرت ملی کو ایک حلا چیلنج تھی۔ اسی سے متاثر ہو کر طلوع اسلام نے بہ عنوان "قوم کے غم میں" اپنے ایک شذرہ میں تحریر کیا۔

ہمدردی یا عیش سامانیاں

.... یہ ان پناہ گزینوں کی امداد ہو رہی ہے، جن میں ہماری لاکھوں مائیں اور بہنیں ایسی ہیں جنہیں ستر ڈھانپنے کے لئے چیتھڑا تک میسّر نہیں۔ جن کے شیر خوار بچے ایک گھونٹ دودھ کی خاطر بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ جن کے معصوم کم سن ایک کمبل کے نہ ہونے سے سردی سے اکڑ کر مر رہے ہیں۔ جنہیں آسمان کی نیلی رواق کے سوا کوئی چھت نصیب نہیں۔ یہ ان کی امداد کے لئے لارنس باغ کی مست فضاؤں میں مستورات کے جھولے جھلائے اور خوشیوں کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ مظلوموں اور بیکسوں کی بپتا مٹانے کے کیسے حسین انداز ہیں۔ دن بھر طرب و نشاط کی محفلیں گرم کیں۔ شام کو دو دو چار چار پیسے اکٹھے کر کے ریلیف فنڈ میں بھیج دیئے۔ اخبارات میں ان بیش بہا قربانیوں کا چرچا ہوا۔ ریڈیو نے اس ایثار کے ڈھول پیٹے۔ بیگم صاحبہ کی "ملی خدمات" پر میاں صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور انہیں آئندہ الیکشن میں لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ نہ ہوئے

آج لسان العصر (حضرت اکبر الہ آبادی) درنہ معلوم ان کی صدائے دردناک آج کیا کچھ کہتی۔

یہ ریلیف فنڈ بھی ہمارے لئے عجیب تماشے کا موجب بن رہے ہیں۔ کسی ڈرامیٹک کمپنی کا نئے سین سینریوں سے کھیل ہو یا کسی سنیما کا نگاہ فریب افتتاح۔ کسی مغنی آتش نفس کی محفل رقص و سرود ہو یا کسی بھانڈ کا تماشا ایک مُشعر کا اعلان ریلیف فنڈ کے لئے کر دیجئے۔ پھر دیکھئے ان میں شرکت کس طرح نہ صرف ملی خدمت میں ہی شمار ہوتی ہے بلکہ کار خیر ہونے کی وجہ سے ثواب کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ کس قدر بدبخت ہیں وہ جو اب بھی محروم رہ جائیں !!

آؤ۔ آگے بڑھو۔ قوم پر ایسی افتاد روز روز نہیں پڑا کرتی۔

پس از مدت گذر افتاد ایں جا کارِ دانے را (ایضاً صفحہ ۲۶-۲۷)

اسی اشاعت میں "لیڈرانیاں" کے عنوان سے ایک شذرہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

ملت کی لیڈرانیاں ..... اس سے بھی زیادہ حیرت کا مقام اس سے ذرا آگے بڑھ کر آتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کرسی حکومت پر بیٹھنے والا ہی اپنے آپ کو ملت کا بہترین دماغ سمجھنے لگ جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی بیگم صاحبہ بھی فوراً لیڈرانی بن جاتی ہیں۔ میاں لڑکوں کے کالج کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں تو بیوی صاحبہ نرسنگ ہوم کے تقسیم انعام کے جلسہ کی صدارت فرما رہی ہیں۔ وہ یوم استقلال کے جشن مسرت میں سنتِ شبیری کی تلقین فرما رہے ہیں اور یہ پردہ باغ کی نمائش میں اسوۂ فاطمیؓ کی تقلید کی تاکید کر رہی ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں معلوم ہے کہ سنتِ شبیریؓ کے غایات کیا ہیں اور نہ انہیں پتہ کہ اسوۂ فاطمیؓ کے مقتضیات کیا۔ لیکن بایں ہمہ وہ مردوں کے واحد قائد ہیں اور یہ عورتوں کی امام۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ قیادت و امامت کن خصوصیات کی بنا پر آپ کے حصہ میں آئی ہے۔ خدا حافظ ہے اس قوم کا جس کی قیادت اس طرح سے بٹ رہی ہو۔ جو لوگ اپنی ذاتی جائیداد تک کا انتظام نہیں کر سکتے انہیں امور سلطنت کا نظم و نسق سونپ دیا جاتا ہے۔ اور جو بیگمات اپنے گھر بھی درست نہیں رکھ سکتیں وہ تعمیر امومت کا فریضہ سنبھال لیتی ہیں ــــ اگر انہی کی زندگیاں قوم کے لئے باعثِ تقلید ہیں تو

خدا ایں سخت جاں را یار بادا!

(ایضاً صفحہ ۳۰-۳۱)

اپریل ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اپنی سرپرستی میں ایک ادبی ماہنامہ "ماہِ نو" کا اجرا کیا۔ اس مجلہ پر کس طرح پانی کی طرح روپیہ بہانا مقصود تھا اور اس کے صفحات کس طرح ادبی عیاشیوں کا سرچشمہ بن رہے تھے یہ سب کچھ ایک طرف اور لاکھوں مہاجرین کی معاشی بے بسی اور خود حکومت کی مالی بیچارگی دوسری طرف۔ نظام ربوبیت کا علمبردار قومی زندگی کے اس نازک مرحلے پر یہ رنگ رلیاں کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے "طاؤس و رباب اوّل" کے عنوان سے اسی اشاعت کے ایک زوردار مقالہ میں اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

ادبی عیاشیاں

ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ ایک ادبی رسالہ کے اجرا سے اس نے بالآخر کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ کیا اچھے افسانے، معیاری اشعار اور لطیف ادب حکومت کا انحصار (Monopoly) ہیں؟... کیا ڈرامے، افسانے، گیت اور غزلیں قوم کی ان مشکلات کا حل پیدا کر دیں گے جن کا رونا ہر وقت رویا جاتا ہے۔ خدا کے لئے کوئی بتائے تو سہی کہ بالآخر وہ کونسی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لئے یہ ادبی رسالہ جاری کیا گیا ہے؟ حکومت کی یہ غلط بخشی ہمارے نزدیک ان قرون ماضیہ کی مسرفانہ یاد ہے جب دربار شاہی میں خوشامدانہ قصائد کے ایک ایک شعر پر شاہی خزانوں کے مُنہ کھول دیئے جاتے تھے اور شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کسی کو بھوک نہیں ستایا کرتی تھی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پاکستان میں ہمہ گیر خلفشار ہے.....

اس مقالہ کے آخر میں طلوع اسلام نے حکومت کو بدیں الفاظ اپنا مخلصانہ مشورہ پیش کیا۔

ہم حکومت سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے۔ اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے۔ موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں..... اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے وہ نہ افسانہ ہے نہ شعر۔ زندگی بجائے خود نہ افسانہ ہے، نہ شعر۔ ہم میدان جنگ میں ہیں۔ زندگی سعیٔ پیہم ہے اور جہاد مسلسل۔ شاعری، زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۵ - ۳۶)

قائداعظم اور سیاسی پارٹیاں

طلوع اسلام کی مذکورہ بالا اشاعت (جون ۱۹۴۸ء) اس حقیقت آفریں اور تاریخی مقالہ کی بھی حامل ہے جو مرحوم و مغفور قائداعظمؒ ـــــ اور اُس دورِ اوّل کے گورنر جنرل ـــــ کی پشاور کی تقریر پر سپردِ قلم کیا گیا۔ قائداعظم نے اس تقریر میں اسلامیان پاکستان سے

کہا تھا کہ وہ دیگر سیاسی جماعتوں کا خیال چھوڑ دیں اور متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ ہو جائیں کیونکہ تنہا اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔ قائدِ اعظم کی شخصیت سے والہانہ عقیدت کے باوجود تنقید کا یہ جرأتمندانہ اور مخلصانہ انداز صرف طلوع اسلام کا امتیاز ہو سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی بخوبی واضح ہو گا کہ اس کے نزدیک حرفِ آخر کا درجہ صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے کسی بڑے سے بڑے قائد کو یہ حق حاصل نہیں۔ "پارٹیاں کس طرح ختم ہو سکتی ہیں" کے اس طویل مقالہ کو یہاں ضمناً پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس کے چند اہم اقتباسات مختصراً درج ذیل ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ مسلم لیگ کی حکومت ہے۔ مسلم لیگ اپنا بہت سا اعتماد کھو چکی ہے اب وہ اتنی ہر دل عزیز نہیں رہی جتنی کہ ہوا کرتی تھی۔ اسے دوبارہ ہر دل عزیز اور واحد نمائندہ بنانے کا یہ طریقہ کہ دیگر جماعتوں کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے یا ان کو مطلوبہ مراعات نہ دی جائیں، غیر آئینی اور غیر جمہوری ہے۔ ہم ایمرجنسی کے ڈر سے ایک ایسی طرزِ حکومت کو رائج بلکہ مسلط کر رہے ہیں جو ملت کو ایک مصیبت سے نکال کر دوسری مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ اس پارٹی آمریت کا نتیجہ ہمہ گیر بدنظمی اور فوضویت (Anarchy) کے علاوہ کچھ نہیں ہو گا۔ قوم کا قابل قدر طبقہ اپنے آپ کو ناخواندہ سمجھنے پر مجبور ہو گا اور قوم ان کی قلبی اور ذہنی متاع سے محروم رہ جائے گی۔

ہم بدقسمتی سے ایک دوری استدلال کا شکار ہیں جہاں علت و معلول میں امتیاز مشکل ہے کیونکہ ہر معلول دوسرے نتیجہ کی علت ہے۔ ہمیں اس سے نکل کر 'صراطِ مستقیم' کی طرف آنا چاہیئے کہ قومی انا کے اظہار کی یہی صحیح صورت ہے۔ ہم چند افراد کے انا کے اظہار کی سبیل تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اجتماعی انا کو محبوس و مقید کر رہے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

اس مقالہ کے اختتام پر طلوع اسلام نے لکھا۔

ہم جانتے ہیں کہ اربابِ مسلم لیگ کو چونکہ لیگ کی مقبولیت پر یقین ہے، اور اس لئے اپنی حکومت کی تشکیل کے امکانات پر اعتماد، اس لئے وہ ہماری اس تجویز کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھیں گے۔ لیکن ہم ان سے باادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنی عارضی حکومت کے امکانات کو ہی سامنے نہ رکھیں، استحکامِ مملکت اور تعمیرِ ملت کے بلند ترین مقاصد کو بھی پیشِ نظر رکھیں اور اس کی یہی صورت ہے کہ

توائے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

پارٹیوں کو توڑ کر حزبِ ملت کر دیجئے۔ اجزاء کو کُل میں سمو دیجئے۔ افراد کو کارواں، ذروں کو صحرا

اور قطروں کو دریا میں تبدیل کر دیجئے۔ یہ کیفیت پیدا کر دیجئے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

اور پھر دیکھئے کہ آپ کی ملت کس قدر حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہو کر فضائے عالم کی ہمہ گیر پہنائیوں پر چھا جاتی ہے.......

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہر سمجھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(ایضاً صفحہ ۴۵-۴۶)

(باقی آیندہ)

اعتذار

زیرِ نظر شمارہ کی تیاری میں وقت کی کمی کے باعث، انتہائی کوشش کے باوجود، بعض مقامات پر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کے لئے ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

(ناظم ادارہ)

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیّت

معاشی مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوعِ انسانی کے لئے بارگاہِ رب العالمین سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظامِ ربوبیت اپنی نوعیت کی بے مثال تصنیف ہے — رعایتی قیمت — چار روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷/بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور